

تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں

مولانا سید ابوالا علی مودودیؒ

اسلامک رسیرچ اکٹیوٹی کراچی

انتساب

مصنف نے اپنی زندگی میں ہی اس کتاب کے جملہ حقوق ”اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی“، کو تفویض کر دیے تھے۔ لہذا اس کتاب یا اس کے کسی حصہ کی اشاعت یا اسے کسی ایکٹر انک ذریعہ ابلاغ میں نقل کرنے کے لیے ”اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی“، کی تحریری اجازت ضروری ہے۔ خلاف ورزی کی صورت میں ادارہ قانونی پارہ جوئی کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

کتاب: تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں

مصنف: مولانا سید ابوالعلی مودودی

ناشر: اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی
(ادارہ معارف اسلامی۔ کراچی)

تقییم کنندہ: اکیڈمی بک سینٹر (A.B.C.)

ڈی۔ ۳۵، بلاک۔ ۵، فیڈرل بی ایریا

کراچی۔ ۷۵۹۵۰

نون: ۰۲۱ (۳۶۸۰۹۲۰۱-۳۲۳۹۸۲۰)۰۲۱

اشاعت: ڈوائچ ۱۳۳۲ھ - نومبر ۲۰۱۴ء

قیمت: روپے

تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیاد میں

[یہ تقریر ۱۲ اپریل ۱۹۷۵ء کو دارالاسلام، نزد پٹھان کوٹ (مشرقی پنجاب) میں جماعت اسلامی کے کل ہند اجتماع کے آخری اجلاس میں کی گئی تھی]

رفقاء و حاضرین! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہماری جدوجہد کا آخری مقصود ”انقلاب امامت“ ہے۔ یعنی دنیا میں ہم جس انتہائی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ فساق و فغار کی امامت و قیادت ختم ہو کر امامت صالحہ کا نظام قائم ہو۔ اسی مقصود عظیم کے لیے سعی و جہد کو ہم دنیا و آخرت میں رضائی اللہ کے حصول کے ذریعہ سمجھتے ہیں۔

یہ چیز جسے ہم نے اپنا مقصد قرار دیا ہے افسوس ہے کہ آج اس کی اہمیت سے مسلم اور غیر مسلم سبھی غافل ہیں۔ مسلمان اس کو محض سیاسی مقصد سمجھتے ہیں اور ان کو کچھ احساس نہیں ہے کہ دین میں اس کی کیا اہمیت ہے۔ غیر مسلم کچھ تھسب کی بنا پر اور کچھ ناداقیت کی وجہ سے اس حقیقت کو جانتے ہی نہیں کہ دراصل فساق و فغار کی قیادت ہی نوع انسانی کے مصائب کی جڑ ہے اور انسان کی بھلانگی کا سارا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ دنیا کے معاملات کی سربراہ کاری صالح لوگوں کے ہاتھوں میں ہو۔ آج دنیا میں جو فساد عظیم برپا ہے، جو ظلم اور طغیان ہو رہا ہے، انسانی اخلاق میں جو عالمگیر بگاڑ رہا ہے، انسانی تمدن اور معاشرت و سیاست کی رگ رگ میں جو زہر سرایت کر گئے ہیں، زمین کے تمام وسائل اور انسانی علوم کی دریافت کردہ ساری قوتیں جس طرح انسان کی فلاح و بہبود کے بجائے اس کی تباہی کے لیے استعمال ہو رہی ہیں، ان سب کی ذمہ داری اگر کسی چیز پر ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ دنیا میں چاہے نیک لوگوں اور شریف انسانوں کی کمی نہ ہو، مگر دنیا کے معاملات ان کے ہاتھ میں نہیں ہیں، بلکہ خدا سے پھرے ہوئے اور مادہ

پرستی و بد اخلاقی میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اب اگر کوئی شخص دنیا کی اصلاح چاہتا ہو اور فساد کو اصلاح سے اضطراب کو امن سے بد اخلاقیوں کو اخلاق صالح سے اور برائیوں کو بھلاکیوں سے بدلنے کا خواہش مند ہو تو اس کے لیے محض نیکیوں کا وعظ اور خدا پرستی کی تلقین اور حسن اخلاق کی ترغیب ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا فرض ہے کہ نوع انسانی میں جتنے صالح عناصر اس کو مل سکیں انہیں ملا کروہ اجتماعی قوت بہم پہنچائے جس سے تمدن کی زمام کار فاسقوں سے چھینی جاسکے اور امامت کے نظام میں تغیر کیا جاسکے۔

زمام کار کی اہمیت

انسانی زندگی کے مسائل میں جس کو تھوڑی سی بصیرت حاصل ہو وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا کہ انسانی معاملات کے بناؤ اور بگاڑ کا آخری فیصلہ جس مسئلے پر محصر ہے وہ یہ سوال ہے کہ معاملاتِ انسانی کی زمام کار کس کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرح گاڑی ہمیشہ اسی سمت چلا کرتی ہے جس سمت پر ڈرا نیور اس کو لے جانا چاہتا ہے اور دوسرے لوگ جو گاڑی میں بیٹھے ہوں خواستہ و ناخواستہ اسی سمت پر سفر کرنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسانی تمدن کی گاڑی بھی اسی سمت پر سفر کیا کرتی ہے جس سمت پر وہ لوگ جانا چاہتے ہیں جن کے ہاتھ میں تمدن کی باغیں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ زمین کے سارے ذرائع جن کے قابو میں ہوں، قوت و اقتدار کی باغیں جن کے ہاتھ میں ہوں، عام انسانوں کی زندگی جن کے دامن سے وابستہ ہوئیں اور نظریات کو بنانے اور ڈھانلنے کے وسائل جن کے قبضے میں ہوں، انفرادی سیرتوں کی تعمیر اور اجتماعی نظام کی تشکیل اور اخلاقی قدرتوں کی تعین جن کے اختیار میں ہوں اک رہنمائی و فرمان روائی کے تحت رہتے ہوئے انسانیت بحثیت مجموعی اس راہ پر چلنے سے کسی طرح بازنہیں رہ سکتی جس پر وہ اسے چلانا چاہتے ہیں۔ یہ رہنماء فرمائزہ، اگر خدا پرست اور صالح لوگ ہوں تو لامحالہ زندگی کا سارا نظام خدا پرستی اور خیر و اصلاح پر چلے گا، برے لوگ بھی اچھے بننے پر مجبور ہوں گے، بھلاکیوں کو نشوونما نصیب ہوگا اور برائیاں اگر میں گی نہیں تو کم از کم پروان بھی نہ چڑھ سکیں گی۔ لیکن اگر رہنمائی و قیادت

اور فرمانروائی کا یہ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو خدا سے برگشته اور فتن و فجور میں سرگشته ہوں تو آپ سے آپ سارا نظام زندگی خدا سے بغاوت اور ظلم و بد اخلاقی و معاملات، عدل و قانون، سب کے سب بحیثیت مجموعی بگڑ جائیں گے۔ برائیاں خوب نشوونما پائیں گی۔ بھلائیوں کو زمین اپنے اندر جگہ دینے سے اور ہوا اور پانی ان کو غذا دینے سے انکار کر دیں گے اور خدا کی زمین ظلم و جور سے لبریز ہو کر رہے گی۔ ایسے نظام میں برائی کی راہ پر چنان آسان اور بھلائی کی راہ پر چنان کیا معمن، قائم رہنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ جس طرح آپ نے کسی بڑے مجمع میں دیکھا ہو گا کہ سارا مجمع جس طرف جا رہا ہو اس طرف چلنے کے لیے تو آدمی کو کچھ قوت لگانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ مجمع کی قوت سے خود بخود اسی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کی مخالف سمت میں کوئی چنانا چاہے تو وہ بہت زور مار کر بھی بہ مشکل ایک آدھ قدم چل سکتا ہے، اور جتنے قدم وہ چلتا ہے مجمع کا ایک ہی ریلا اس سے کئی گنے زیادہ قدم اسے پیچھے دھکلیں دیتا ہے۔ اسی طرح اجتماعی نظام بھی جب غیر صالح لوگوں کی قیادت میں کفر و فتن کی راہوں پر چل پڑتا ہے تو افراد اور گروہوں کے لیے غلط راہ چنانا تو اتنا آسان ہو جاتا ہے کہ انہیں بطور خود اس پر چلنے کے لیے کچھ زور لگانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، لیکن اگر وہ اس کے خلاف چنانا چاہیں تو اپنے جسم و جان کا سارا زور لگانے پر بھی ایک آدھ قدم ہی راہ راست پر بڑھ سکتے ہیں اور اجتماعی رو، ان کی مزاحمت کے باوجود انہیں دھکلیں کر میلوں پیچھے ہٹالے جاتی ہے۔

یہ بات جو میں عرض کر رہا ہوں، یہ اب کوئی ایسی نظری حقیقت نہیں رہی ہے جسے ثابت کرنے کے لیے دلائل کی ضرورت ہو، بلکہ واقعات نے اسے ایک بدیہی حقیقت بنادیا ہے جس سے کوئی صاحب دیدہ بینا انکار نہیں کر سکتا۔ آپ خود ہی دیکھ لیں کہ پچھلے سو برس کے اندر آپ کے اپنے ملک میں کس طرح خیالات و نظریات بد لے ہیں، مذاق اور مزاج بد لے میں، سوچنے کے انداز اور دیکھنے کے زاویے بد لے ہیں، تہذیب و اخلاق کے معیار اور قدر و قیمت کے پیانا بد لے ہیں اور کوئی چیز رہ گئی ہے جو بدل نہ گئی ہو۔ یہ سارا تغیر جو دیکھتے ہیں آپ کی اسی سر زمین میں ہوا اس کی اصلی وجہ آخر کیا ہے؟ کیا آپ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور بتاسکتے ہیں

کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں زمام کا تھی اور رہنمائی و فرمانروائی کی باؤں پر جن کا قبضہ تھا، انہوں نے پورے ملک کے اخلاق، اذہان، نفیسیات، معاملات اور نظام تمدن کو اس سانچے میں ڈھال کر رکھ دیا جو ان کی اپنی پسند کے مطابق تھا۔ پھر جن طاقتوں نے اس تغیریکی مزاجمت کی، ذرا ناپ کر دیکھیے کہ انہیں کامیابی کتنی ہوئی اور ناکامی کتنی۔ کیا یہ واقعہ انہیں ہے کہ کل جو مزاجمت کی تحریک کے پیشواد تھے، آج ان کی اولاد وقت کی رو میں بھی چلی جا رہی ہے اور ان کے گھروں تک میں بھی وہی سب کچھ پہنچ گیا ہے جو گھروں سے باہر پھیل چکا تھا؟ کیا یہ واقعہ انہیں ہے کہ مقدس ترین مذہبی پیشوادوں تک کی نسل سے وہ لوگ اٹھ رہے ہیں جنہیں خدا کے وجود اور وحی و رسالت کے امکان میں بھی شک ہے؟ اس مشاہدے اور تجربے کے بعد بھی کیا کسی کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامل ہو سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے مسائل۔ میں اصل فیصلہ کرن مسئلہ زمام کا رکھا مسئلہ ہے؟ اور یہ اہمیت اس مسئلے نے پچھے آج ہی اختیار نہیں کی ہے بلکہ ہمیشہ سے اس کی بھی اہمیت رہی ہے۔ الناس علی دین ملوکہم بہت پرانا مقولہ ہے۔ اور اسی بنا پر حدیث میں قوموں کے بناؤ اور بگاڑ کا ذمہ دار ان کے علماء اور امراء کو قرار دیا گیا ہے، کیونکہ لیدر شپ اور زمام کا رانہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

امامت صالح کا قیام دین کا حقیقی مقصود ہے

اس تشریع کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ دین میں اس مسئلے کی کیا اہمیت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کا دین اول تو یہ چاہتا ہے کہ لوگ بالکل یہ بندہ حق بن کر رہیں اور ان کی گردان میں اللہ کے سوا کسی اور کسی بندگی کا حلقو نہ ہو۔ پھر وہ چاہتا ہے کہ اللہ ہی کا قانون ان لوگوں کی زندگی کا قانون بن کر رہے۔ پھر اس کا مطالبہ یہ ہے کہ زمین سے فساد مٹے اور ان منکرات کا استیصال کیا جائے جو اہل زمین پر اللہ کے غصب کے موجب ہوتے ہیں اور ان خیرات و حسنات کو فروع دیا جائے جو اللہ کو پسند ہیں۔ ان تمام مقاصد میں سے کوئی مقصد بھی اس طرح پورا نہیں ہو سکتا کہ نوع انسانی کی رہنمائی و قیادت اور معاملات انسانی کی سر براد کاری آئندہ کفر و ضلال کے ہاتھوں میں ہو اور دین حق کے پیرو خص ان کے ماتحت رہ کر ان کی دی ہوئی

رعايانوں اور گنجائشوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یاد خدا کرتے رہیں۔ یہ مقاصد تو لازمی طور پر اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ تمام اہل خیر و اصلاح جو اللہ کی رضا کے طالب ہوں اجتماعی قوت پیدا کریں اور سر دھڑکی بازی لگا کر ایک ایسا نظام حق قائم کرنے کی سعی کریں جس میں امامت و رہنمائی اور قیادت و فرمائی کا منصب مومنین وصالحین کے ہاتھوں میں ہو۔ اس چیز کے بغیر وہ مدعا حاصل ہی نہیں ہو سکتا جو دین کا اصل مدعا ہے۔

اسی لیے دین میں امامت صالح کے قیام اور نظامِ حق کی اقامت کو مقصدی اہمیت حاصل ہے اور اس چیز سے غفلت برتنے کے بعد کوئی عمل ایسا نہیں ہو سکتا جس سے انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کو پہنچ سکے۔ غور کیجئے، آخوند قرآن و حدیث میں التزام جماعت اور سمع و اطاعت پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص جماعت سے خروج اختیار کر لے تو اس سے فال واجب ہے، خواہ وہ کلمہ تو حید کا قائل اور نماز روزے کا پابند ہی کیوں نہ ہو؟ کیا اس کی وجہ یہ اور صرف یہی نہیں ہے کہ امامت صالح اور نظامِ حق کا قیام و بقاء دین کا حقیقی مقصد ہے۔ اور اس مقصد کا حصول اجتماعی طاقت پر موقوف ہے، لہذا جو شخص اجتماعی طاقت کو نقصان پہنچاتا ہے وہ اتنا بڑے جرم کا ارتکاب کرتا ہے جس کی تلافی نہ نماز سے ہو سکتی ہے اور نہ اقرار تو حید سے؟ پھر دیکھیے کہ آخر اس دین میں جہاد کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے کہ اس سے جی چرانے اور منہ موڑنے والوں پر قرآن مجید نفاق کا حکم رکھاتا ہے؟ جہاد نظامِ حق کی سعی کا ہی تو دوسرا نام ہے اور قرآن اسی جہاد کو وہ کسوٹی قرار دیتا ہے جس پر آدمی کا ایمان پر کھا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر جس کے دل میں ایمان ہو گا وہ نہ نظامِ باطل کے نسلط پر راضی ہو سکتا ہے اور نہ نظامِ حق کے قیام کی جدوجہد میں جان و مال سے دریغ کر سکتا ہے۔ اس معاملے میں جو شخص کمزوری دکھائے اس کا ایمان ہی مشتبہ ہے، پھر بھلا کوئی دوسرا عمل اسے کیا نفع پہنچا سکتا ہے؟

اس وقت اتنا موقع نہیں ہے کہ میں آپ کے سامنے اس مسئلے کی پوری تفصیل بیان کروں۔ مگر جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لیے بالکل کافی ہے کہ اسلام کے نقطہ نظر سے امامت صالح کا قیام مرکزی اور مقصدی اہمیت رکھتا ہے۔ جو شخص اس دین پر ایمان لا لایا ہواں کا کام صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا کہ اپنی زندگی کو

حتی الامکان اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔ بلکہ عین اس کے ایمان ہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی تمام سُجی و جہد کو اس ایک مقصد پر مرکوز کر دے کہ زمام کار کفار و فساق کے ہاتھ سے نکل کر صالحین کے ہاتھ میں آئے اور وہ نظامِ حق قائم ہو جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق دنیا کے انتظام کو درست کرے اور درست رکھے۔ پھر چونکہ یہ مقصد اعلیٰ اجتماعی کوشش کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اس لیے ایک ایسی جماعتِ صالح کا وجود ضروری ہے جو خود اصولِ حق کی بندگی ہو اور نظامِ حق کو قائم کرنے باقی رکھنے اور ٹھیک ٹھیک چلانے کے سواد نیا میں کوئی دوسرا غرض پیش نظر نہ رکھے۔ روئے زمین پر اگر صرف ایک ہی آدمی مومن ہو تو بھی اس کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ اپنے آپ کو اکیلا پا کر اور ذرا رائج مفتوح دیکھ کر نظامِ باطل کے تسلط پر راضی ہو جائے یا اہون البلعیتین کے شرعی حلیے تلاش کر کے غالبہ کفر و فسق کے ماتحت کچھ آدمی پونی مذہبی زندگی کا سودا چکانا شروع کر دے۔ بلکہ اس کے لیے سیدھا اور صاف راستہ صرف یہی ایک ہے کہ بندگان خدا کو اس طریقی زندگی کی طرف بلائے جو خدا کو پسند ہے۔ پھر اگر کوئی اس کی بات سن کر نہ دے تو اس کا ساری عمر صراطِ مستقیم پر کھڑے ہو کر لوگوں کو پکارتے رہنا اور پکارتے پکارتے مرجانا اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ وہ اپنی زبان سے وہ صدائیں بلند کرنے لگے جو خلافت میں بھکھی ہوئی دنیا کو مرغوب ہوں اور ان را ہوں پر چل پڑے جن پر کفار کی امامت میں دنیا چل رہی ہو اور اگر کچھ اللہ کے بندے اس کی بات سننے پر آمادہ ہو جائیں تو اس کے لیے لازم ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ایک جتحا بنائے اور یہ جتحا اپنی تمام اجتماعی قوت اس مقصد عظیم کے لیے جدو جہد کرنے میں صرف کر دے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔

حضرات! مجھے خدا نے دین کا جو تھوڑا بہت علم دیا ہے اور قرآن و حدیث کے مطالعہ سے جو کچھ بصیرت مجھے حاصل ہوئی ہے اس سے میں دین کا تقاضا یہی کچھ سمجھا ہوں۔ یہی میرے نزدیک کتابِ الہی کا مطالبہ ہے یہی انبیاء کی سنت ہے اور میں اپنی اس رائے سے ہٹ نہیں سکتا جب تک کوئی خدا کی کتاب اور رسول کی سنت ہی سے مجھ پر ثابت نہ کر دے کہ دین کا یہ تقاضا نہیں ہے۔

امامت کے باب میں خدا کی سنت

اپنی سعی کے اس مقصد میں ہم اس سنت اللہ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے جس کے تحت ہم اپنے اس مقصود کو پاسکتے ہیں۔ یہ کائنات جس میں ہم رہتے ہیں، اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک قانون پر بنایا ہے اور اس کی ہر چیز ایک لگے بند ہے ضابطے پر چل رہی ہے۔ یہاں کوئی سعی محض پا کیزہ خواہشات اور اچھی نیتوں کی بنا پر کامیاب نہیں ہو سکتی، اور نہ محض نفوس قدیمه کی برکتیں ہی، اس کو بار آور کر سکتی ہیں، بلکہ اس کے لیے ان شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے جو ایسی مسامی کی بار آوری کے لیے قانونِ الہی میں مقرر ہیں۔ آپ اگر زراعت کریں تو خواہ آپ کتنے ہی بزرگ صفت انساں ہوں اور تسبیح و تحمل میں کتنا ہی مبالغہ کرتے ہوں، بہر حال آپ کا پھینکا ہوا کوئی تیج بھی برگ و بار نہیں لاسکتا جب تک آپ اپنی سعی کاشتکاری میں اس قانون کی پوری پوری پابندی ملحوظ نہ رکھیں، جو اللہ تعالیٰ نے حکیتوں کی بار آوری کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ اسی طرح نظام امامت کا وہ انتقال بھی جو آپ کے پیش نظر ہے، کبھی محض دعاوں اور پاک تمناؤں سے رونما نہ ہو سکے گا۔ بلکہ اس کے لیے بھی ناگزیر ہے کہ آپ اس قانون کو سمجھیں اور اس کی ساری شرطیں پوری کریں جس کے تحت دنیا میں امامت قائم ہوتی ہے، کسی کو ملتی ہے اور کسی سے چھپتی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی میں اس مضمون کو اپنی تحریروں اور تقریروں میں اشارہ بیان کرتا رہا ہوں، لیکن آج میں اسے مزید تفصیل و تشریح کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ یہ وہ مضمون ہے جسے پوری طرح سمجھے بغیر، ہمارے سامنے اپنی راہ عمل واضح نہیں ہو سکتی۔

انسان کی ہستی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر دو مختلف حیثیتیں پائی جاتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں اور باہم ملی جلی بھی۔

اس کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ وہ اپنا ایک طبعی و حیوانی وجود رکھتا ہے جس پر وہی قوانین جاری ہوتے ہیں جو تمام طبیعت و حیوانات پر فرمانروائی کر رہے ہیں۔ اس وجود کی کارکردگی منحصر ہے ان آلات و وسائل پر، ان مادی ذرائع پر اور ان طبعی حالات پر جن پر دوسری تمام طبیعت اور حیوانی موجودات کی کارکردگی کا اختصار ہے۔ یہ وجود جو کچھ کر سکتا ہے قوانین طبعی کے تحت،

آلات وسائل کے ذریعے سے اور طبیعی حالات کے اندر ہی رہتے ہوئے کر سکتا ہے اور اس کے کام پر عالم اسباب کی تمام قوتیں مخالف یا موافق اثر ڈالتی ہیں۔

دوسری حیثیت جو انسان کے اندر نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کے انسان ہونے، یا بالفاظ دیگر ایک اخلاقی وجود ہونے کی حیثیت ہے۔ یہ اخلاقی وجود طبعات کا تابع نہیں ہے۔ بلکہ ان پر ایک طرح سے حکومت کرتا ہے۔ یہ خود انسان کے طبیعی و حیوانی وجود کو بھی آلبے کے طور پر استعمال کرتا ہے اور خارجی دنیا کے اسباب کو بھی اپنا تابع بنانے اور ان سے کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی کارکن قوتیں وہ اخلاقی اوصاف ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان میں ودیعت فرمائے ہیں۔ اور اس پر فرمائز و ای بھی طبیعی قوانین کی نہیں بلکہ اخلاقی قوانین کی ہے۔

انسانی عروج وزوال کا مدار اخلاق پر ہے

یہ دونوں حیثیتیں انسان کے اندر ملی جلی کام کر رہی ہیں اور مجموعی طور پر اس کی کامیابی و ناکامی اور اس کے عروج وزوال کا مدار مادی اور اخلاقی دونوں قسم کی قوتیں پر ہے۔ وہ بے نیاز نہ تو مادی قوت ہی سے ہو سکتا ہے اور نہ اخلاقی قوت ہی سے۔ اسے عروج ہوتا ہے تو دونوں کے بل پر ہوتا ہے اور وہ گرتا ہے تو اسی وقت گرتا ہے جب یہ دونوں طاقتیں اس کے ہاتھ سے جاتی رہتی ہیں، یا ان میں وہ دوسروں کی نسبت کمزور ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر غائز نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ انسانی زندگی میں اصل فیصلہ کن مادی وسائل کا حصول، طبیعی ذرائع کا استعمال، اور اسباب خارجی کی موافقت بھی کامیابی کے لیے شرط لازم ہے اور جب تک انسان اس عالم طبیعی میں رہتا ہے یہ شرط کسی طرح ساقط نہیں ہو سکتی۔ مگر وہ اصل چیز جو انسان کو گراتی اور اٹھاتی ہے اور جسے اس کی قسمت کے بنانے اور بگاڑنے میں سب سے بڑھ کر دخل حاصل ہے وہ اخلاقی طاقت ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم جس چیز کی وجہ سے انسان کو انسان کہتے ہیں وہ اس کی جسمانیت یا حیوانیت نہیں بلکہ اس کی اخلاقیت ہے۔ آدمی دوسری موجودات سے جس خصوصیت کی بنا پر ممیز ہوتا ہے وہ نہیں ہے کہ وہ جگہ گھیرتا ہے یا سانس لیتا ہے یا نسل گشی کرتا ہے۔ بلکہ اس کی وہ انتیازی خصوصیت جو اسے ایک مستقل نوع ہی نہیں

خلیفۃ اللہ فی الارض بناتی ہے، وہ اس کا اخلاقی اختیار اور اخلاقی ذمہ داری کا حامل ہونا ہے۔ پس جب اصل جو ہر انسانیت اخلاق ہے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اخلاقیات ہی کو انسانی زندگی کے بناؤ اور بگاڑ میں فیصلہ کن مقام حاصل ہے اور اخلاقی قوانین ہی انسان کے عروج و زوال پر فرمازروایا ہیں۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد جب ہم اخلاقیات کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہ اصولی طور پر ہمیں دو بڑے شعبوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔

ایک بنیادی انسانی اخلاقیات، دوسرے اسلامی اخلاقیات۔

بنیادی انسانی اخلاقیات

بنیادی انسانی اخلاقیات سے مراد وہ اوصاف ہیں جن پر انسان کے اخلاقی وجود کی اساس قائم ہے۔ ان میں وہ تمام صفات شامل ہیں جو دنیا میں انسان کی کامیابی کے لیے بہر حال شرط لازم ہیں، خواہ وہ صحیح مقصد کے لیے کام کر رہا ہو یا غلط مقصد کے لیے۔ ان اخلاقیات میں اس سوال کا کوئی دخل نہیں ہے کہ آدمی خدا اور روحی اور رسول اور آخرت کو مانتا ہے یا نہیں، ٹھہارت نفس اور نیت خیر اور عملِ صالح سے آرستہ ہے یا نہیں، اچھے مقصد کے لیے کام کر رہا ہے یا برے مقصد کے لیے۔ قطع نظر اس سے کہ کسی میں ایمان ہو یا نہ ہو، اور اس کی زندگی پاک ہو یا ناپاک، اس کی سمعی کا مقصد اچھا ہو یا برا، جو شخص اور جو گروہ بھی اپنے اندر وہ اوصاف رکھتا ہو گا جو دنیا میں کامیابی کے لیے ناگزیر ہیں وہ۔ یقیناً کامیاب ہو گا اور ان لوگوں سے بازی لے جائے گا جو ان اوصاف کے لحاظ سے اس کے مقابلے میں ناقص ہوں گے۔

مومن ہو یا کافر، نیک ہو یا بد مصلحت ہو یا مفسد، غرض جو بھی ہو وہ اگر کارگر انسان ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں جب کہ اس کے اندر ارادے کی طاقت اور فیصلے کی قوت ہو، عزم اور حوصلہ، صبر و ثبات اور استقلال ہو، تحمل اور برداشت ہو، ہمت اور شجاعت ہو، مستعدی و جفا کشی ہو، اپنے مقصد کا عشق اور اس کے لیے ہر چیز قربان کر دینے کا بل بوتا ہو، حزم و احتیاط اور معاملہ نہیں و تدبیر ہو، حالات کو سمجھنے اور ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے اور مناسب تدبیر کرنے کی

قابلیت ہو اپنے جذبات و خواہشات اور ہیجانات پر قابو ہو، اور دوسرے انسانوں کو موبہنے اور ان کے دل میں جگہ بیدا کرنے اور ان سے کام لینے کی صلاحیت ہو۔

پھر ناگزیر ہے کہ اس کے اندر وہ شریفانہ خصائص بھی کچھ موجود ہوں جو فی الحقیقت جو ہر آدمیت ہیں اور جن کی بدولت آدمی کا وقار و اعتبار دنیا میں قائم ہوتا ہے۔ مثلاً خودداری، فیاضی، رحم، ہمدردی، انصاف، وسعتِ قلب و نظر، سچائی، امانت، راست بازی، پاسِ عہد، معقولیت، اعتدال، شائستگی، طہارت و نظافت اور ذہن و نفس کا انضباط۔

یہ اوصاف اگر کسی قوم یا گروہ کے بیشتر افراد میں موجود ہوں تو گویا یوں سمجھتے کہ اس کے پاس وہ سرمایہ انسانیت موجود ہے جس سے ایک طاقتور اجتماعی صفت وجود میں آسکتی ہے۔ لیکن یہ سرمایہ مجتمع ہو کر بالفعل ایک مضبوط و مستحکم اور کارگر اجتماعی طاقت نہیں بن سکتا جب تک کچھ دوسرے اخلاقی اوصاف بھی اس کی مدد پر نہ آئیں۔ مثلاً تمام یا بیشتر افراد کسی اجتماعی نصب اعین پر متفق ہوں اور اس نسب اعین کو اپنی انفرادی اغراض، بلکہ اپنی جان، مال اور اولاد سے بھی عزیز تر رکھیں۔ ان کے اندر آپس کی محبت اور ہمدردی ہو، انہیں مل کر کام کرنا آتا ہو۔ وہ اپنی خودی و نفسانیت کو کم از کم اس حد تک قربان کر سکیں جو منظم سی کے لیے ناگزیر ہے۔ وہ صحیح و غلط رہنماؤں میں تمیز کر سکتے ہوں اور موزوں آدمیوں ہی کو اپنارہنماؤں میں۔ ان کے رہنماؤں میں اخلاص اور حسن تدبیر اور رہنمائی کی دوسری ضروری صفات موجود ہوں۔ اور خود قوم یا جماعت بھی اپنے رہنماؤں میں اخلاص اور حسن تدبیر اور رہنمائی کی دوسری ضروری صفات موجود ہوں۔ اور خود قوم یا جماعت بھی اپنے رہنماؤں کی اطاعت کرنا جانتی ہو، ان پر اعتماد کرھتی ہو، اور اپنے تمام ہنئی، جسمانی اور مادی ذرائع ان کے تصرف میں دے دینے پر تیار ہو۔ نیز پوری قوم کے اندر ایسی زندہ اور حساس رائے عام پائی جاتی ہو جو کسی ایسی چیز کو اپنے اندر پہنچنے نہ دے جو اجتماعی فلاح کے لیے نقصان دہ ہو۔

یہ ہیں وہ اخلاقیات جن کو میں ”بنیادی اخلاقیات“ کے لفظ سے تعبیر کرتا ہوں۔ کیونکہ فی الواقع یہی اخلاقی اوصاف انسان کی اخلاقی طاقت کا اصل منبع ہیں اور انسان کسی مقصد کے لیے بھی دنیا میں کامیاب سی نہیں کر سکتا جب تک ان اوصاف کا زور اس کے اندر موجود نہ

ہو۔ ان اخلاقیات کی مثال ایسی ہے جیسے فولاد کہ وہ اپنی ذات میں مضبوطی واستحکام رکھتا ہے اور اگر کوئی کارگر ہتھیار بن سکتا ہے تو اسی سے بن سکتا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ غلط مقصد کے لیے استعمال ہو یا صحیح مقصد کے لیے۔ آپ کے پیش نظر صحیح مقصد ہوت بھی آپ کے لیے مفید و ہی ہتھیار ہو سکتا ہے جو فولاد سے بنا ہونے کہ سڑی گلی پھنس پھنسی لکڑی سے جو ایک ذرا سے بوجھا اور معمولی سی چوٹ کی بھی تاب نہ لاسکتی ہو۔ یہی وہ بات ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ خیار کم فی الجahiliyah خیار کم فی الاسلام۔ ”تم میں جو لوگ اپنے اندر جو ہر قابل رکھتے تھے وہی زمانہ اسلام میں مردانہ کار ثابت ہوئے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کی قابلیتیں پہلے غلط را ہوں میں صرف ہو رہی تھیں اور اسلام نے آ کر انہیں صحیح راہ پر لگادیا۔ مگر بہر حال ناکارہ انسان نہ جاہلیت کے کسی کام کے تھے نہ اسلام کے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں جوز بر دست کامیابی حاصل ہوئی اور جس کے اثرات تھوڑی ہی مدت گزرنے کے بعد دریائے سندھ سے لے کر اٹلانٹک کے ساحل تک دنیا کے ایک بڑے حصے نے محسوس کر لیے، اس کی وجہ یہی تو تھی کہ آپ کو عرب میں بہترین انسانی موالی گیا تھا جس کے اندر کیر کٹر کی زبردست طاقت موجود تھی۔ اگر خدا نتوانست آپ کو بودے، کم ہمت ضعیف الارادہ اور ناقابل اعتماد لوگوں کی بھیڑ مل جاتی تو کیا پھر بھی وہ نتائج نکل سکتے تھے؟

اسلامی اخلاقیات

اب اخلاقیات کے دوسرے شعبے کو بیجیے جسے میں ”اسلامی اخلاقیات“ کے لفظ سے تعبیر کر رہا ہوں۔ یہ بیوادی انسانی اخلاقیات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی تصحیح اور تکمیل ہے۔ اسلام کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ بیوادی انسانی اخلاقیات کو ایک صحیح مرکز و محور مہیا کر دیتا ہے جس سے وابستہ ہو کر وہ سر اپا خیر بن جانتے ہیں۔ اپنی ابتدائی صورت میں تو یہ اخلاقیات مجرد ایک قوت ہیں جو خیر بھی ہو سکتی ہے اور شر بھی۔ جس طرح تلوار کا حال ہے کہ وہ بس ایک کاٹ ہے جوڑا کو کے ہاتھ میں جا کر آلہ ظلم بھی بن سکتی ہے اور مجاهد فی سبیل اللہ کے ہاتھ میں جا کر

وسیلہ خیر بھی۔ اسی طرح ان اخلاقیات کا بھی کسی شخص یا گروہ میں ہونا بجائے خود نہیں ہے بلکہ اس کا خیر ہونا موقف ہے اس امر پر کہ یہ قوت صحیح راہ میں صرف ہو اور اس کو صحیح راہ پر لگانے کی خدمت اسلام انجام دیتا ہے۔ اسلام کی دعوت تو حید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں انسان کی تمام کوششوں اور محتنوں کا اور اس کی دوڑ دھوپ کا مقصد و حید اللہ تعالیٰ کی زندگی میں انسان کی تمام کوششوں اور محتنوں کا اور اس کی دوڑ دھوپ کا مقصد واحد اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو۔ والیک نسعی و نحدف۔ خدا یا ہماری ساری کوششوں اور ساری دوڑ دھوپ تیری ہی خوشنودی کے لیے ہے اور اس کا پورا دائرہ فکر و عمل ان حدود سے محدود ہو جائے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دی ہیں۔ ایسا کہ نعبد لوک نصلی و نسجد خدا یا ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تیرے ہی لیے نماز اور سجدے کرتے ہیں۔ اس اساسی اصلاح کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمام بینادی اخلاقیات جن کا ابھی میں نے آپ سے ذکر کیا ہے صحیح راہ پر لگ جاتے ہیں اور وہ قوت جوان اخلاقیات کی موجودگی سے پیدا ہوتی ہے، بجائے اس کے لئے اس کے نفس یا خاندان یا قوم یا ملک کی سر بلندی پر ہر ممکن طریقے سے صرف ہو خالص حق کی سر بلندی پر صرف جائز طریقوں ہی سے صرف ہونے لگتی ہے۔ یہی چیز اس کو ایک مجرد قوت کے مرتبے سے اٹھا کرایجا گا ایک بھلائی اور دنیا کے لیے ایک رحمت بنادیتی ہے۔

دوسرا کام جوا خلاق کے باب میں اسلام کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بینادی انسانی اخلاقیات کو مستحکم بھی کرتا ہے اور پھر ان کے اطلاق کو انتہائی حد و تک وسیع بھی کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر صبر کو لیجئے۔ بڑے سے بڑے صابر آدمی میں بھی جو صبر دنیوی اغراض کے لیے ہو اور جسے شرک یا مادہ پرستی کی فکری جڑوں سے غذا مل رہی ہو اس کی برداشت اور اس کے ثبات و قرار کی بس ایک حد ہوتی ہے جس کے بعد وہ گھبرا لختا ہے۔ لیکن جس صبر کو تو حید کی جڑ سے غذا ملے اور جو دنیا کے لیے نہیں بلکہ اللہ رب العالمین کے لیے ہو وہ تحمل و برداشت اور پامردی کا ایک اتحاد خزانہ ہوتا ہے جسے دنیا کی تمام ممکن مشکلات مل کر بھی لوث نہیں سکتیں۔ پھر غیر مسلم کا صبر نہایت محدود نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ ابھی گلوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں نہایت استقلال کے ساتھ ڈٹا ہوا تھا اور ابھی جو جذبات شہوانی کی تسلیم کا کوئی موقع

سامنے آیا تو نفس امارہ کی ایک معمولی تحریک کے مقابلے میں بھی نہ تھہر سکا لیکن اسلام صبر کو انسان کی پوری زندگی میں پھیلا دیتا ہے اور اسے صرف چند مخصوص قسم کے خطرات، مصائب اور مشکلات ہی کے مقابلے میں نہیں بلکہ ہر اس لائق، ہر اس خوف، ہر اس اندیشے اور ہر اس خواہش کے مقابلے میں ٹھیک اور کی ایک زبردست طاقت بنادیتا ہے جو آدمی کو راہ راست سے ہٹانے کی کوشش کرے۔ درحقیقت اسلام مومن کی پوری زندگی کو ایک صابر انہ زندگی بناتا ہے جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ عمر بھر صحیح طرز عمل پر قائم رہو خواہ اس میں کتنے ہی خطرات و نقصانات اور مشکلات ہوں اور اس دنیا کی زندگی میں اس کا کوئی مفید نتیجہ نکلتا نظر نہ آئے اور کبھی نکرو عمل کی برائی اختیار نہ کرو خواہ فائدوں اور امیدوں کا کیسا ہی خوشناس بزرگ تمہارے سامنے لہلہ ہار ہا ہو۔ یہ آخرت کے قطعی متأجح کی توقع پر دنیا کی ساری زندگی میں بدی سے رکنا اور خیر کی راہ پر جم کر چلنا اسلامی صبر ہے اور اس کا ظہور لا زماً ان شکلوں میں بھی ہوتا ہے جو بہت محدود پیمانے پر کفار کی زندگی میں نظر آتی ہیں۔ اسی مثال پر دوسرے تمام بنیادی اخلاقیات کو بھی آپ قیاس کر سکتے ہیں۔ کفار کی زندگی میں صحیح فکری بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے وہ ضعیف اور محدود ہوتے ہیں اور اسلام ان سب کو ایک صحیح بنیاد پر کر محکم بھی کرتا ہے اور وسیع بھی کر دیتا ہے۔

اسلام کا تیرا کام یہ ہے کہ وہ بنیادی اخلاقیات کی ابتدائی منزل پر اخلاقی فاضلہ کی ایک نہایت شاندار بالائی منزل تعمیر کرتا ہے، جس کی بدولت انسان اپنے شرف کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے۔ وہ اس کے نفس کو خود غرضی سے نفسانیت سے ظلم سے بے حیائی اور خلاعت و بے قیدی سے پاک کر دیتا ہے۔ اس میں خدا ترسی، تقویٰ و پر ہیز گاری اور حق پرستی پیدا کرتا ہے۔ اس کے اندر اخلاقی ذمہ داریوں کا شعور و احساس ابھارتا ہے۔ اس کو ضبط نفس کا خوگر بناتا ہے۔ اسے تمام مخلوقات کے لیے کریم، فیاض، رحیم، ہمدرد، امین، بے غرض، خیر خواہ، بے لوٹ مصنف، اور ہر حال میں صادق و راست باز بنادیتا ہے اور اس میں ایک ایسی بلند پایہ سیرت پرورش کرتا ہے جس سے ہمیشہ صرف بھلائی ہی متوقع ہو اور برائی کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ پھر اسلام آدمی کو محض نیک ہی بنانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ حدیث رسولؐ کے الفاظ میں وہ اسے مفتاح

للخیر مغلاق للشر (بھلائی کا دروازہ کھولنے والا اور برائی کا دروازہ بند کرنے والا) بناتا ہے، یعنی وايجاباً یہ مشن اس کے سپرد کرتا ہے کہ دنیا میں بھلائی پھیلائے اور برائی کو روکے۔ اس سیرت و اخلاق میں فطرتاً و حسن ہے، وہ کشش ہے، وہ بلا کی قوت تحسیر ہے کہ اگر کوئی منظم جماعت اس سیرت کی حامل ہو اور عملًا اپنے اس مشن کے لیے کام بھی کرے جو اسلام نے اس کے سپرد کیا ہے تو اس کی جہانگیری کا مقابلہ کرنا دنیا کی کسی قوت کے بس کا کام نہیں ہے۔

سنۃ اللہ در باب امامت کا خلاصہ

اب میں چند الفاظ میں اس سنۃ اللہ کو بیان کئے دیتا ہوں جو امامت کے باب میں ابتدائے آفرینش سے جاری ہے اور جب تک نوع انسانی اپنی موجودہ فطرت پر زندہ ہے اس وقت تک برابر جاری رہے گی۔ اور وہ یہ ہے:

اگر دنیا میں کوئی منظم انسانی گروہ ایسا موجود نہ ہو جو اسلامی اخلاقیات اور بنیادی انسانی اخلاقیات دونوں سے آراستہ ہو اور پھر مادی اسباب و وسائل بھی استعمال کرے، تو دنیا کی امامت و قیادت لازماً کسی ایسے گروہ کے قبضے میں دے دی جاتی ہے جو اسلامی اخلاقیات سے چاہے بالکل ہی عاری ہو لیکن بنیادی انسانی اخلاقیات اور مادی اسباب و وسائل کے اعتبار سے دوسروں کی بُنیت زیادہ بڑھا ہوا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر حال اپنی دنیا کا انتظام چاہتا ہے اور یہ انتظام اسی گروہ کے سپرد کیا جاتا ہے جو موجود وقت گروہوں میں اہل تر ہو۔

لیکن اگر کوئی منظم گروہ ایسا موجود ہو جو اسلامی اخلاقیات اور بنیادی انسانی اخلاقیات دونوں میں باقی ماندہ انسانی دنیا پر فضیلت رکھتا ہو اور وہ مادی اسباب و وسائل کے استعمال میں بھی کوتا ہی نہ کرے، تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا گروہ دنیا کی امامت و قیادت پر قابض رہ سکے۔ ایسا ہونا فطرت کے خلاف ہے، اللہ کی اس سنۃ کے خلاف ہے جو اللہ نے اپنی کتاب میں مؤمنین و صالحین سے کئے ہیں اور اللہ ہرگز فساد پسند نہیں کرتا کہ اس کی دنیا میں ایک صاحل گروہ انتظام عالم کو ٹھیک ٹھیک اس کی رضا کے مطابق درست رکھنے والا موجود ہو اور

پھر بھی وہ مفسدوں ہی کے ہاتھ میں اس انتظام کی باغ ڈور رہنے دے۔ مگر یہ خیال رہے کہ اس نتیجے کا ظہور صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ ایک جماعتِ صالح ان اوصاف کی موجود ہو۔ کسی ایک صالح فرد یا متفرق طور پر بہت سے صالح افراد کے موجود ہونے سے استخلاف فی الارض کا نظام تبدیل نہیں ہو سکتا، خواہ وہ افراد اپنی جگہ کیسے ہی زبردست اولیاء اللہ بلکہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہوں۔ اللہ نے استخلاف کے متعلق جتنے وعدے بھی کئے ہیں، منتشر و متفرق افراد سے نہیں، بلکہ ایک ایسی جماعت سے کئے ہیں جو دنیا میں اپنے آپ کو عملًا "خیر امت" اور "امت وسط" ثابت کر دے۔

نیز یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ایسے ایک گروہ کے محض وجود میں آجانے ہی سے نظام امامت میں تغیر واقع نہ ہو جائے گا کہ ادھروہ بنے اور ادھر اچانک آسمان سے کچھ فرشتے اتریں اور فساق و فجار کو اقتدار کی گدی سے ہٹا کر انہیں منڈشین کر دیں۔ بلکہ اس جماعت کو کفر و فتن کی طاقتov سے زندگی کے ہر میدان میں، ہر قدم پر کشمکش اور جایہ لکرنا ہو گا اور اقامت حق کی راہ میں ہر قسم کی قربانیاں دے کر اپنی محبت حق اور اپنی الہیت کا ثبوت دینا پڑے گا۔ یہ ایسی شرط ہے جس سے انبیاءؑ تک مستثنی نہ رکھے گئے، کجا کہ آج کوئی اس سے مستثنی ہونے کی توقع کرے۔

بنیادی اخلاقیات اور اسلامی اخلاقیات کی طاقت کا فرق

مادی طاقت اور اخلاقی طاقت کے تناوب کے باہ میں قرآن اور تاریخ کے غائز مطالعہ سے جو سنت اللہ میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ جہاں اخلاقی طاقت کا سارا انحصار صرف بنیادی انسانی اخلاقیات پر ہو وہاں مادی وسائل بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس امر کا بھی امکان ہے کہ اگر ایک گروہ کے پاس مادی وسائل کی طاقت بہت زیادہ ہو تو وہ تھوڑی اخلاقی طاقت سے بھی دنیا پر چھا جاتا ہے اور دوسرے گروہ اخلاقی طاقت میں فائق تر ہونے کے باوجود محض وسائل کی کمی کے باعث دبے رہتے ہیں۔ لیکن جہاں اخلاقی طاقت میں اسلامی اور بنیادی دونوں قسم کے اخلاقیات کا پورا زور شامل ہو وہاں مادی وسائل کی انتہائی کمی کے باوجود اخلاق کو آخر کار ان تمام طاقتov پر غلبہ حاصل ہو کر رہتا ہے جو مجرد بنیادی اخلاقیات اور مادی سروسامان

کے بل بوتے پڑھی ہوں۔ اس نسبت کو یوں سمجھنے کہ بنیادی اخلاقیات کے ساتھ اگر سورجے مادی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے تو اسلامی اور بنیادی اخلاقیات کی مجموعی قوت کے ساتھ صرف ۲۵ درجے مادی طاقت کافی ہو جاتی ہے، باقی ۵۷ فیصدی قوت کی کمی کو محض اسلامی اخلاق کا زور پورا کر دیتا ہے۔ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کا تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ اسلامی اخلاق اگر اس پیمانے کا ہو جو حضور اور آپ کے صحابہ کا تھا تو صرف پانچ فیصدی مادی طاقت سے بھی کام چل جاتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف آیت ان يَكُنْ مِنْكُمْ عَشْرُونَ صَابِرُونَ يَعْلَمُوا مِائَتَيْنِ ”اگر تم میں سے بیس صابرآدمی ہوں تو وہ دوسو پر غالب آئیں گے،“ (الانفال رکوع ۹۶) میں اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ آخری بات جو میں نے عرض کی ہے اسے محض خوش عقیدگی پر محمل نہ کیجیے، اور نہ یہ گمان کیجیے کہ میں کسی مجرمے و کرامت کا آپ سے ذکر کر رہا ہوں۔ نہیں، یہ بالکل فطری حقیقت ہے جو اسی عالم اسباب میں قانون علت و معلول کے تحت پیش آتی ہے اور ہر وقت رونما ہو سکتی ہے اگر اس کی علت موجود ہو۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آگے بڑھنے سے پہلے چند الفاظ میں اس کی تشریح کر دوں کہ اسلامی اخلاقیات سے، جن میں بنیادی اخلاقیات خود بخود شامل ہیں، مادی اسباب کی ۵۷ فیصدی بلکہ ۹۵ فیصدی تک کمی طرح پوری ہو جاتی ہے۔

اس چیز کو سمجھنے کے لیے آپ ذرا خود اپنے زمانے ہی کی بین الاقوامی صورت حال پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھئے۔ ابھی آپ کے سامنے وہ فساد عظیم جو آج سے سائز ہے پانچ سال پہلے شروع ہوا تھا (اشارہ ہے جگ عظیم نمبر ۲ کی طرف جو اس تقریر کے وقت جاری تھی)۔ جرمی کی شکست پر ختم ہوا ہے اور جاپان کی شکست بھی قریب نظر آ رہی ہے۔ جہاں تک بنیادی اخلاقیات کا تعلق ہے ان کے اعتبار سے اس فساد کے دونوں فریق تقریباً مساوی ہیں، بلکہ بعض پہلوؤں سے جرمی اور جاپان نے اپنے حریقوں کے مقابلے میں زیادہ زبردست اخلاقی طاقت کا ثبوت دیا ہے۔ جہاں تک علوم طبعی اور ان کے عملی استعمال کا تعلق ہے اس میں بھی دونوں فریق برابر ہیں، بلکہ اس معاملے میں کم از کم جرمی کی فویقت تو کسی سے مخفی نہیں ہے۔ مگر صرف ایک چیز ہے جس میں ایک فریق دوسرے فریق سے بہت زیادہ بڑھا ہوا ہے، اور وہ

ہے مادی اسباب کی موافقت اس کے پاس آدمی اپنے دونوں حریقوں (جمنی و جاپان) سے کئی گنے زیادہ ہیں اس کو مادی وسائل ان کی نسبت بدر جہازیادہ حاصل ہیں۔ اس کی جغرافی پوزیشن اس سے بہتر ہے۔ اور اس کو تاریخی اسباب نے ان کے مقابلے میں بہت زیادہ بہتر حالات فراہم کر دیے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کو فتح نصیب ہوئی ہے اور اسی وجہ سے آج کسی ایسی قوم کے لیے بھی جس کی تعداد کم ہو اور جس کی دسترس میں مادی وسائل کم ہوں، اس امر کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ وہ کثیر التعداد اور کثیر الوسائل قوموں کے مقابلے میں سراٹھا سکے خواہ وہ بنیادی اخلاقیات میں اور طبعی علوم کے استعمال میں ان سے کچھ بڑھ ہی کیوں نہ جائے۔ اس لیے کہ بنیادی اخلاقیات اور طبعی علوم کے بل پر اٹھنے والی قوم کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو وہ خود اپنی قومیت کی پرستار ہو گی اور دنیا کو اپنے لیے مسخر کرنا چاہے گی، یا پھر وہ کچھ عالمگیر اصولوں کی حامی بن کر اٹھے گی اور دوسری قوموں کو ان کی طرف دعوت دے گی۔ پہلی صورت میں تو اس کے لیے کامیابی کی کوئی شکل بجز اس کے ہے ہی نہیں کہ وہ مادی طاقت اور وسائل میں دوسروں سے فاٹک تر ہو۔ کیونکہ وہ تمام قویں جن پر اس کی حرکت اقتدار کی زد پڑ رہی ہو گی، اپنائی غصہ و نفرت کے ساتھ اس کی مراجحت کریں گی اور اس کا راستہ روکنے میں اپنی حد تک کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گی۔ رہی دوسری صورت اس میں بلاشبہ اس کا امکان تو ضرور ہے کہ قوموں کے دل و دماغ خود بخود اس کی اصولی دعوت سے مسخر ہوتے چلے جائیں اور اسے مراجحتوں کو راستے سے ہٹانے میں بہت تھوڑی قوت استعمال کرنی پڑے۔ لیکن یہ یاد رہنا چاہیے کہ دل صرف چند خوش آئند اصولوں ہی سے مسخر نہیں ہو جایا کرتے بلکہ انہیں مسخر کرنے کے لیے وہ حقیقی خیر خواہی، نیک نیتی، راست بازی، بغرضی، فراغدلی، فیاضی، ہمدردی اور شرافت وعدالت درکار ہے جو جنگ اور صلح، فتح اور شکست، دوستی اور دشمنی، تمام حالات کی کڑی آزمائشوں میں کھڑی اور بے لوث ثابت ہو۔ اور یہ چیز اخلاقی فاضلہ کی اس بلند منزل سے تعلق رکھتی ہے جس کا مقام بنیادی اخلاقیات سے بہت برتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمد بنیادی اخلاقیات اور مادی طاقت کے بل پر اٹھنے والے خواہ کھلے قوم پرست ہوں یا پوشیدہ قوم پرستی کے ساتھ کچھ عالمگیر اصولوں کی دعوت و حمایت کا ڈھونگ

رجائیں، آخر کار ان کی ساری جدوجہد اور کشمکش خالص شخصی یا طبقاتی یا قومی خود غرضی ہی پر آٹھ بھرتی ہے، جیسا کہ آج آپ امریکا، برطانیہ اور روس کی سیاست خارجیہ میں نمایاں طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ ایسی کشمکش میں یہ ایک بالکل فطری امر ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کے مقابلے میں ایک مضبوط چنان بن کر کھڑی ہو جائے، اپنی پوری اخلاقی و مادی طاقت اس کی مزاحمت میں صرف کر دے اور اپنے حدود میں اس کو ہرگز راہ دینے کے لیے تیار نہ ہو جب تک کہ مخالف کی برتر مادی قوت اس کو پیس کرنے رکھ دے۔

اچھا، اب ذرا تصور کیجیے کہ اسی ماحول میں ایک ایسا گروہ (خواہ وہ ابتدأ ایک ہی قوم میں سے اٹھا ہو مگر ”قوم“ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ”جماعت“ کی حیثیت سے اٹھا ہو) پایا جاتا ہے جو شخصی، طبقاتی اور قومی خود غرضیوں سے بالکل پاک ہے۔ اس کی سعی و جہد کی کوئی غرض اس کے سوانحیں ہے کہ وہ نوع انسانی کی فلاح چند اصولوں کی پیروی میں دیکھتا ہے اور انسانی زندگی کا نظام ان پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ ان اصولوں پر جو سو سائیٰ وہ بناتا ہے اس میں قومی وطنی اور طبقاتی و نسلی انتیازات بالکل مفقوہ ہیں۔ تمام انسان اس میں یکساں حقوق اور مساوی حیثیت سے شامل ہو سکتے ہیں۔ اس میں رہنمائی و قیادت کا منصب ہر اس شخص یا مجموعہ اشخاص کو حاصل ہو سکتا ہے جو ان اصولوں کی پیروی میں سب پروفیت لے جائے قطع نظر اس سے کہ اس کی نسلی وطنی قومیت کچھ ہی ہو۔ حتیٰ کہ اس میں اس امر کا بھی امکان ہے کہ اگر مفتوح ایمان لا کر اپنے آپ کو صالح تر ثابت کر دے تو اسکی اپنی سرفوشیوں اور جانشیوں کے سارے ثمرات اس کے قدموں میں لا کر رکھ دے اور اس کو امام مان کر خود مقتدری بننا قبول کر لے۔ یہ گروہ جب اپنی دعوت لے کر اٹھتا ہے تو وہ لوگ جو اس کے اصولوں کو چلنے دینا نہیں چاہتے، اس کی مزاحمت کرتے ہیں اور اس طرح فریقین میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ مگر اس کشمکش میں جتنی شدت بڑھتی جاتی ہے، یہ گروہ اپنے مخالفوں کے مقابلے میں اتنے ہی زیادہ افضل واشرف اخلاق کا ثبوت دیتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے طرز عمل سے ثابت کر دینا ہے کہ واقعی وہ خلق اللہ کی بھلائی کے سوا کوئی دوسری غرض پیش نظر نہیں رکھتا۔ اس کی دشمنی اپنے مخالفوں کی ذات یا قومیت سے نہیں بلکہ صرف ان کی ضلالت و

گمراہی سے ہے جسے وہ چھوڑ دیں تو وہ اپنے خون کے پیاسے دشمن کو بھی سینے سے لگا سکتا ہے۔ اسے لالج ان کے مال و دولت یا ان کی تجارت و صنعت کا نہیں بلکہ خود انہی کی اخلاقی اور روحانی فلاح کا ہے جو حاصل ہو جائے تو ان کی دولت انہیں کومبارک رہے۔ وہ سخت سے سخت آزمائش کے موقعوں پر بھی جھوٹ، دعا اور مکروہ فریب سے کام نہیں لیتا۔ ٹیڈی چالوں کا جواب بھی سیدھی تدبیروں سے دیتا ہے۔ انتقام کے جوش میں بھی ظلم و زیادتی پر آمادہ نہیں ہوتا۔ جنگ کے سخت لمحوں میں بھی اپنے ان اصولوں کی پیروی نہیں چھوڑتا جن کی دعوت دینے کے لیے وہ اٹھا ہے۔ سچائی، وقار، عہد اور حسن معاملت پر ہر حال میں قائم رہتا ہے۔ بے لاگ انصاف کرتا ہے اور امانت و دیانت کے اس معیار پر پورا اترتتا ہے جسے ابتدأ اس نے دنیا کے سامنے معیار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ مخالفین کی زانی، شرابی، جواری اور سنگ دل و بے رحم فوجوں سے اس گروہ کے خدا ترس پاک باز، عبادت گزار، نیک دل اور حیم و کریم مجاہدوں کا مقابلہ پیش آتا ہے تو فرد افراد اُن کی انسانیت ان کی درندگی و حیوانیت پر فاقہ نظر آتی ہے۔ وہ ان کے پاس زخمی یا قیدی ہو کر آتے ہیں تو یہاں ہر طرف نیکی، شرافت اور پاکیزگی، اخلاق کا ماحول و کیھ کران کی آسودہ نجاست رو جیں بھی پاک ہونے لگتی ہیں۔ اور یہاں گرفتار ہو کر جاتے ہیں تو ان کا جو ہر انسانیت اس تاریک ماحول میں زیادہ چمک اٹھتا ہے۔ ان کو کسی علاقے پر غلبہ حاصل ہوتا ہے تو مفتاح آبادی کو انتقام کی جگہ عفو، ظلم و جور کی جگہ رحم و انصاف، شقاوت کی جگہ ہمدردی، پروپیگنڈوں کی جگہ اصولِ حق کی تبلیغ کا تجربہ ہوتا ہے اور وہ یہ دیکھ کر عشق کرنے لگتے ہیں کہ فاتح سپاہی نہ ان سے عورتیں مانگتے ہیں، نہ دبے چھپے مال ٹوٹتے پھرتے ہیں، نہ ان کے صفتی رازوں کا سراغ لگاتے ہیں، نہ ان کی معاشی طاقت کو کچلنے کی فکر کرتے ہیں، نہ ان کی قومی عزت کو خوکر مارتے ہیں، بلکہ انہیں اگر کچھ فکر ہے تو یہ کہ جو ملک اب ان کے چارج میں ہے اس کے باشندوں میں سے کسی کی عصمت خراب نہ ہو، کسی کے مال کو نقصان نہ پہنچے، کوئی اپنے جائز حقوق سے محروم نہ ہو، کوئی بد اخلاقی ان کے درمیان پروش نہ پاسکے اور اجتماعی ظلم و جور کسی شکل میں بھی وہاں باقی نہ رہے۔ بخلاف اس کے جب فریق مخالف کسی علاقے میں گھس آتا ہے تو ساری آبادی اس کی زیادتیوں اور

بے رحمیوں سے جیت اٹھتی ہے۔ اب آپ خود ہی اندازہ کر لیں کہ ایسی لڑائی میں قوم پرستانہ لڑائیوں کی بہ نسبت کتنا بڑا فرق واقع ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسے مقابلے میں بالآخر انسانیت کمتر مادی سروسامان کے باوجود اپنے مخالفوں کی آہن پوش حیوانیت کو آخر کار شکست دے کر رہے ہیں۔ اخلاقی فاضلہ کے ہتھیار توپ و تفنگ سے زیادہ دور مارثابت ہوں گے۔ عین حالت جنگ میں دشمن دوستوں میں تبدیل ہوں گے۔ جسموں سے پہلے دل مسخر ہوں گے۔ آبادیوں کی آبادیاں لڑائے بھڑے بغیر مفتوح ہو جائیں گی اور یہ صالح گروہ جب ایک مرتبہ مٹھی بھر جمعیت اور تھوڑے سے سروسامان کے ساتھ اپنا کام شروع کروے گا تو رفتہ رفتہ خود مخالف کمپ ہی سے اس کو جزل سپاہی ماہرین فون، اسلحہ رسڈ، سامان جنگ سب کچھ حاصل ہوتے چلے جائیں گے۔

یہ جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں یہ زانیاں اور اندازہ نہیں ہے بلکہ اگر آپ کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور مبارک کی تاریخی مثال موجود ہو تو آپ پرواخت ہو جائے گا کہ فی الواقع اس سے پہلے یہی کچھ ہو چکا ہے اور آج بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے۔ بشرطکہ کسی میں یہ تجربہ کرنے کی ہمت ہو۔

حضرات مجھے توقع ہے کہ اس تقریر سے یہ حقیقت آپ کے ذہن نشین ہو گئی ہو گی کہ طاقت کا اصل منبع اخلاقی طاقت ہے۔ اگر دنیا میں کوئی منظم گروہ ایسا موجود ہو جو بنیادی اخلاقیات کے ساتھ اسلامی اخلاقیات کا زور بھی اپنے اندر رکھتا ہو اور مادی وسائل سے بھی کام لے تو یہ بات عقلانیمی اور فطرت نا غیر ممکن ہے کہ اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا گروہ دنیا کی امامت و قیادت پر قابض رہ سکے۔ اس کے ساتھ مجھے امید ہے کہ آپ نے یہ بھی اچھی طرح سمجھ لیا ہو گا کہ مسلمانوں کی موجودہ پست حالی کا اصل سبب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ نہ مادی وسائل سے کام لیں، نہ بنیادی اخلاقیات سے آ راستہ ہوں، اور نہ اجتماعی طور پر ان کے اندر اسلامی اخلاقیات ہی پائے جائیں، وہ کسی طرح بھی امامت کے منصب پر فائز نہیں رہ سکتے۔ خدا کی اٹل بے لالگ سنت کا تقاضا یہی ہے کہ ان پر ایسے کافروں کو ترجیح دی جائے جو اسلامی اخلاقیات سے عاری ہیں مگر کم از کم بنیادی اخلاقیات اور مادی وسائل کے استعمال میں تو ان

سے بڑھے ہوئے ہیں، اور اپنے آپ کو ان کی بُنیتِ انتظامِ دنیا کے لیے اہل تر ثابت کر رہے ہیں۔ اس معاملے میں اگر آپ کو کوئی شکایت ہو تو سنت اللہ سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے ہونی چاہیے اور اس شکایت کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ آپ اب اپنی اس خامی کو دور کرنے کی فکر کریں جس نے آپ کو امام سے مقدمی اور پیش رو سے پس رو بنا کر چھوڑا ہے۔

اس کے بعد ضرورت ہے کہ میں صاف اور واضح طریقے سے آپ کے سامنے اسلامی اخلاقیات کی بنیادوں کو بھی پیش کروں، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اس معاملے میں عام طور پر مسلمانوں کے تصورات بری طرح الجھے ہوئے ہیں۔ اس الجھن کی وجہ سے بہت ہی کم آدمی یہ جانتے ہیں کہ اسلامی اخلاقیات فی الواقع کس چیز کا نام ہے اور اس پہلو سے انسان کی تربیت و تکمیل کے لیے کیا چیزیں کس ترتیب و تدریج کے ساتھ اس کے اندر پرورش کی جانی چاہیں۔

اسلامی اخلاقیات کے چار مراتب

جس چیز کو ہم اسلامی اخلاقیات سے تعبیر کرتے ہیں وہ قرآن و حدیث کی رو سے دراصل چار مراتب پر مشتمل ہے..... ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان۔ یہ چاروں مراتب یہکے بعد دیگرے اس فطری ترتیب پر واقع ہیں کہ ہر بعد کا مرتبہ پہلے مرتبے سے پیدا اور لازماً اسی پر قائم ہوتا ہے اور جب تک نیچے والی منزل پختہ و مکمل نہ ہو جائے دوسری منزل کی تعمیر کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔ اس پوری عمارت میں ایمان کو بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ اس بنیاد پر اسلام کی منزل تعمیر ہوتی ہے۔ پھر اس کے اوپر تقویٰ اور سب سے اوپر احسان کی منزل میں اٹھتی ہیں۔ ایمان نہ ہو تو اسلام و تقویٰ یا احسان کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں۔ ایمان کمزور ہو تو اس پر کسی بالائی منزل کا بوجھ نہیں ڈالا جاسکتا یا ایسی کوئی منزل تعمیر کر بھی دی جائے تو وہ بودی اور مترابزیل ہو گی۔ ایمان محدود ہو تو جتنے حدود میں وہ محدود ہو گا اسلام، تقویٰ اور احسان بھی بس انہی حدود تک محدود رہیں گے۔ پس جب تک ایمان پوری طرح صحیح، پختہ اور وسیع نہ ہو کوئی مرد عاقل جو دین کا فہم رکھتا ہو اسلام، تقویٰ یا احسان کی تعمیر کا خیال نہیں کر سکتا۔ اسی

طرح تقویٰ سے پہلے اسلام اور احسان سے پہلے تقویٰ کی تصحیح، پختگی اور توسعہ ضروری ہے۔ لیکن انکا ذہن دیکھتے ہیں کہ لوگ اس فطری و اصولی ترتیب کو نظر انداز کر کے ایمان و اسلام کی تکمیل کے بغیر تقویٰ و احسان کی باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ افسوس ناک یہ ہے کہ بالعموم لوگوں کے ذہنوں میں ایمان و اسلام کا ایک نہایت محدود و تصور جاگزیں ہے۔ اسی وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ محض وضع، قطع، لباس، نشست و برخاست، اكل و شرب اور ایسی ہی چند ظاہری چیزوں کو ایک مقرر نقشہ پڑھال لینے سے تقویٰ کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اور پھر عبادات میں نوافل، واذکار، اور ادوات طائف اور ایسے ہی بعض اعمال اختیار کر لینے سے احسان کا بلند مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ بسا اوقات اسی ”تقویٰ“ اور ”احسان“ کے ساتھ ساتھ لوگوں کی زندگیوں میں ایسی صریح علامات بھی نظر آتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی ان کا ایمان ہی سرے سے درست اور پختہ نہیں ہوا ہے۔ یہ غلطیاں جب تک موجود ہیں کسی طرح یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ ہم اسلامی اخلاقیات کا نصاب پورا کرنے میں کبھی کامیاب ہو سکیں گے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ ہمیں ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کے ان چاروں مراتب کا پورا پورا تصور بھی حاصل ہو اور اس کے ساتھ ہم ان کی فطری ترتیب کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں۔

ایمان

اس سلسلے میں سب سے پہلے ایمان کو لجیئے جو اسلامی زندگی کی بنیاد ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ تو حیدر سالت کے اقرار کا نام ایمان ہے۔ اگر کوئی شخص اس کا اقرار کر لے تو اس سے وہ قانونی شرط پوری ہو جاتی ہے جو دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے رکھی گئی ہے اور وہ اس کا مستحق ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ مسلمانوں کا سامعالمہ کیا جائے۔ مگر کیا یہی سادہ اقرار جو ایک قانونی ضرورت پوری کرنے کے لیے کافی ہے، اس غرض کے لیے بھی کافی ہو سکتا ہے کہ اسلامی زندگی کی ساری سہ منزلہ عمارت صرف اسی بنیاد پر قائم ہو سکے؟ لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں اور اسی لیے جہاں یہ اقرار موجود ہوتا ہے وہاں عملی اسلام اور تقویٰ اور احسان کی تعمیر شروع کر دی

جاتی ہے جو اکثر ہوائی تلقعہ سے زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن فی الواقع ایک مکمل اسلامی زندگی کی تعمیر کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ایمان اپنی تفصیلات میں پوری طرح وسیع اور اپنی گھرائی میں اچھی طرح مستحکم ہو۔ ایمان کی تفصیلات میں سے جو شعبہ بھی چھوٹ جائے گا، اسلامی زندگی کا وہی شعبہ تعمیر ہونے سے رہ جائے گا اور اس کی گھرائی میں جہاں بھی کسر رہ جائے گی اسلامی زندگی کی عمارت اسی مقام پر بودی ثابت ہوگی۔

مثال کے طور پر ایمان باللہ کو دیکھنے جو دین کی اولین بنیاد ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ خدا کا اقرار اپنی سادہ صورت سے گزر کر جب تفصیلات میں پہنچتا ہے تو لوگوں کے ذہن میں اس کی بے شمار صورتیں ہن جاتی ہیں۔ کہیں وہ صرف اس حد پر ختم ہو جاتا ہے کہ بے شک خدا موجود ہے اور دنیا کا خالق ہے اور اپنی ذات میں اکیلا ہے کہیں اس کی انہنائی وسعت بس اتنی ہوتی ہے کہ خدا ہمارا معبود ہے اور ہمیں اس کی پرستش کرنی چاہیے۔ کہیں خدا کی صفات اور اس کے حقوق و اختیارات کا تصور کچھ زیادہ وسیع ہو کر بھی اس سے آگے نہیں بڑھتا کہ عالم الغیب، سمیع و بصیر، سمیع الدعوات و قاضی الحاجات اور ”پرستش“ کی تمام جزوی شکلوں کا مستحق ہونے میں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے، اور یہ کہ ”زندہ ہی معاملات“ میں آخری سند خدا ہی کی کتاب ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مختلف تصورات سے ایک ہی طرز کی زندگی نہیں بن سکتی، بلکہ جو تصور جتنا محدود ہے عملی زندگی اور اخلاق میں بھی لازماً اسلامی رنگ اتنا ہی محدود ہوگا، حتیٰ کہ جہاں عام مذہبی تصورات کے مطابق ایمان باللہ اپنی انہنائی وسعت پر پہنچ جائے گا وہاں بھی اسلامی زندگی اس سے آگے نہ بڑھ سکے گی کہ خدا کے باغیوں کی وفاداری اور خدا کی وفاداری ایک ساتھی جائے، یا نظامِ کفر اور نظامِ اسلام کو سوکرا ایک مرکب بنالیا جائے۔

اسی طرح ایمان باللہ کی گھرائی کا پیانہ بھی مختلف ہے۔ کوئی خدا کا اقرار کرنے کے باوجود اپنی کسی معمولی سے معمولی چیز کو بھی خدا پر قربان کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ کوئی بعض چیزوں سے خدا کو عزیز تر رکھتا ہے مگر بعض چیزوں اسے خدا سے عزیز تر ہوتی ہیں۔ کوئی اپنی جان مال تک خدا پر قربان کر دیتا ہے مگر اپنے روحانات نفس اور اپنے نظریات و افکار کی پائیداری و ناپائیداری بھی متعین ہوتی ہے اور انسان کا اسلامی اخلاق ٹھیک اسی مقام پر دغاوے جاتا ہے۔

جہاں اس کے نیچے ایمان کی بنیاد کمزور رہ جاتی ہے۔
ایک مکمل اسلامی زندگی کی عمارت اگر اٹھ سکتی ہے تو صرف اُسی اقرارِ توحید پر اٹھ سکتی ہے جو انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی پر وسیع ہو جس کے مطابق انسان اپنے آپ کو اور اپنی ہر چیز کو خدا کی ملک سمجھے۔ اس کو اپنا اور تمام دنیا کا ایک ہی جائز مالک، معبدو، مطلع اور صاحب امر و نبی تسلیم کرے۔ اسی کو ہدایت کا سرچشمہ مانے اور پورے شعور کے ساتھ اس حقیقت پر مطمئن ہو جائے کہ خدا کی اطاعت سے انحراف، یا اس کی ہدایت سے بے نیازی، یا اس کی ذات و صفات اور حقوق و اختیارات میں غیر کی شرکت جس پہلو اور جس رنگ میں بھی ہے سراسر ضلالت ہے۔ پھر اس عمارت میں اگر انتکام پیدا ہو سکتا ہے تو صرف اسی وقت جبکہ آدمی پورے شعور اور پورے ارادے کے ساتھ یہ فیصلہ کرے کہ وہ اور اس کا سب کچھ اللہ کا ہے اور اللہ ہی کے لیے ہے۔ اپنے معیار پسند و ناپسند کو ختم کر کے اللہ کی پسند و ناپسند کے تابع کر دے۔ اپنی خودسری کو مٹا کر اپنے نظریات و خیالات، خواہشات و جذبات اور انداز فکر کو اس علم کے مطابق ڈھال لے کو خدا نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ اپنی تمام ان وفادریوں کو دریا بردا کر دے جو خدا کی وفاداری کے تابع نہ ہوں بلکہ اس کے م مقابل بھی ہوئی ہوں یا بن سکتی ہوں اپنے دل میں سب سے بلند مقام پر خدا کی محبت کو بھائے اور ہر اس بہت کوڈھونڈ کر اپنے نہانخانہ دل سے نکال پھینکنے جو خدا کے مقابلے میں عزیز تر ہونے کا مطالبہ کرتا ہو۔ اپنی محبت اور نفرت، اپنی دوستی اور دشمنی، اپنی رغبت اور کراہیت، اپنی صلح اور جنگ، ہر چیز کو خدا کی مرضی میں اس طرح گم کر دے کہ اس کا نفس وہی چاہنے لگے جو خدا چاہتا ہے اور اسی سے بھاگنے لگے جو خدا کو ناپسند ہے۔ یہ ہے ایمان باللہ کا حقیقی مرتبہ اور آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں ایمان ہی ان حیثیات سے اپنی وسعت و ہمہ گیری اور اپنی پختگی و مضبوطی میں ناقص ہو وہاں تقویٰ یا احسان کا کیا امکان ہو سکتا ہے۔ کیا اس نقص کی کسر داڑھیوں کے طول اور لباس کی تراش خراش یا سجنہ، گردانی و تہجد خوانی سے پوری کی جاسکتی ہے؟

اسی پر دوسرے ایمانیات کو بھی قیاس کر لیجیے۔ نبوت پر ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک انسان کا نفس زندگی کے سارے معاملات میں نبی کو اپنارہنماء مان لے اور اس کی

رہنمائی کے خلاف یا اس سے آزاد چنی رہنمائیاں ہوں ان کو رد کرو۔۔۔ کتاب پر ایمان اس وقت تک ناقص ہی رہتا ہے جب تک نفس میں کتاب اللہ کے بتائے ہوئے اصول زندگی کے سوا کسی دوسری چیز کے تسلط پر رضامندی کا شاید بھی باقی ہو یا اتباع ما انزل اللہ کو پنی اور ساری دنیا کی زندگی کا قانون دیکھنے کے لیے قلب و روح کی بے چینی میں کچھ بھی سراٹھانہ رکھے گا۔ اسی طرح آخرت پر ایمان بھی مکمل نہیں کہا جا سکتا جب تک نفس پوری طرح آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے اور اخروی قدروں کے مقابلے میں دینیوی قدروں کو ٹھکرادینے پر آمادہ نہ ہو جائے اور آخرت کی جوابد ہی کا خیال اسے زندگی کی ہر راہ پر چلتے ہوئے قدم قدم پر لکھنے نہ لگے یہ بنیاد میں ہی جہاں پوری نہ ہوں آخر وہاں اسلامی زندگی کی عالیشان عمارت کس شے پر تعمیر ہوگی؟ جب لوگوں نے ان بنیادوں کی توسعہ و تکمیل اور پختگی کے بغیر تعمیر اخلاق اسلامی کو ممکن سمجھا، تب ہی تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ کتاب اللہ کے خلاف فیصلہ کرنے والے بحث، غیر شرعی قوانین کی بنیاد پر مقدمے لڑانے والے وکیل، نظامِ کفر کے مطابق معاملات زندگی کا انتظام کرنے والے کارکن، کافرانہ اصول تمدن و ریاست پر زندگی کی تشکیل و تاسیس کے لیے لڑانے والے لیڈر اور پیر، غرض سب کے لیے تقویٰ و احسان کے مرابت عالیہ کا دروازہ کھل گیا، بشرطیکہ وہ اپنی زندگی کے ظاہری انداز و اطوار کو ایک خاص نقشہ پر ڈھال لیں، اور کچھ نوافل و اذ کار کی عادت ڈال لیں۔

اسلام

ایمان کی یہ بنیاد میں جن کا میں نے بھی آپ سے ذکر کیا ہے، جب مکمل اور گہری ہو جاتی ہیں، تب ان پر اسلام کی منزل شروع ہوتی ہے۔۔۔ اسلام دراصل ایمان کے عملی ظہور کا دوسرا نام ہے۔ ایمان اور اسلام کا باہمی تعلق ویسا ہی ہے جیسا بیچ اور درخت کا تعلق ہوتا ہے۔ بیچ میں جو کچھ اور جیسا کچھ موجود ہوتا ہے وہی درخت کی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ درخت کا امتحان کر کے با آسانی یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ بیچ میں کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ آپ نہ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ بیچ اس میں موجود بھی ہو، پھر بھی درخت پیدا نہ ہو۔ ایسا ہی معاملہ ایمان اور

اسلام کا ہے جہاں ایمان موجود ہوگا، لازماً اس کاظھور آدمی کی عملی زندگی میں، اخلاق میں، برداشت میں، تعلقات کے کٹنے اور جڑنے میں، دوڑ دھوپ کے رخ میں، مذاق و مزاج کی افادات میں، سمعی و جہد کے راستوں میں، اوقات اور قوتوں اور قابلیتوں کے مصرف میں، غرض مظاہر زندگی کے ہر ہر جزو میں ہو کر رہے گا ان میں سے جس پہلو میں بھی اسلام کے بجائے غیر اسلام ظاہر ہو رہا ہو۔ یقین کر لیجیے کہ اس پہلو میں ایمان موجود نہیں ہے یا ہے تو بالکل بودا اور بے جان ہے۔ اور اگر عملی زندگی ساری کی ساری ہی غیر مسلمانہ شان سے بسر ہو رہی ہو تو جان لیجیے کہ دل ایمان سے خالی ہے یا زمین اتنی بخبر ہے کہ ایمان کا بیچ برگ و باربیں لا رہا ہے۔ بہر حال میں نے جہاں تک قرآن و حدیث کو سمجھا ہے یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ دل میں ایمان ہو اور عمل میں اسلام نہ ہو۔

(اس موقع پر ایک صاحب نے اٹھ کر پوچھا کہ ایمان اور عمل کو آپ ایک ہی چیز سمجھتے ہیں یا ان دونوں میں کچھ فرق ہے؟ اس کے جواب میں کہا.....)

آپ تھوڑی دیر کے لیے اپنے ذہن سے ان بحثوں کو نکال دیں جو فہرہ اور متكلمین نے اس مسئلے میں کی ہیں اور قرآن سے اس معاملے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اعتقادی ایمان اور عملی اسلام لازم و ملزم ہیں۔ اللہ تعالیٰ جگہ جگہ ایمان اور عمل صالح کا ساتھ ساتھ ڈکر کرتا ہے اور تمام اچھے وعدے جو اس نے اپنے بندوں سے کئے ہیں انہی لوگوں سے متعلق ہیں جو اعتقاد اور مون اور عمل مسلم ہوں۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں منافقین کو پکڑا ہے وہاں ان کے عمل ہی کی خرابیوں سے ان کے ایمان کے نقص پر دلیل قائم کی ہے اور عملی اسلام ہی کو حقیقی ایمان کی علامت تھہرا دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قانونی لحاظ سے کسی شخص کو کافر تھہرا نے اور امت سے اس کا رشتہ کاٹ دینے کا معاملہ دوسرا ہے اور اس میں انہائی احتیاط لحوظہ تھی چاہیے۔ مگر میں یہاں اس ایمان و اسلام کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جس پر دنیا میں فقہی احکام مترب ہوتے ہیں، بلکہ یہاں ذکر اس ایمان و اسلام کا ہے جو خدا کے ہاں معتبر ہے اور جس پر اخروی متناجح مرتب ہونے والے ہیں۔ قانونی نقطہ نظر کو چھوڑ کر حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے اگر آپ دیکھیں گے تو یقیناً یہی پائیں گے

کہ جہاں عملًا خدا کے آگے سپر اندازی اور سپردگی و حواگی میں کمی ہے، جہاں نفس کی پسند خدا کی پسند سے مختلف ہے، جہاں خدا کی وفاداری کے ساتھ غیر کی وفاداری بھر رہی ہے، جہاں خدا کا دین قائم کرنے کی سعی کے بجائے دوسرے مشاغل میں انشہاک ہے، جہاں کوششیں اور محنتیں راہ خدا کے بجائے دوسری را ہوں میں صرف ہو رہی ہیں، وہاں ضرور ایمان میں نقص ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ناقص ایمان پر تقویٰ اور احسان کی تعمیر نہیں ہو سکتی، خواہ ظاہر کے اعتبار سے متقيوں کی سی وضع بنانے اور محسنین کے سے بعض اعمال کی نقل اتنا نے کی تکنی ہی کوشش کی جائے۔ ظاہر فریب شکلیں اگر حقیقت کی روح سے خالی ہوں تو ان کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسی ایک نہایت خوبصورت آدمی کی لاش بہترین وضع و ہیئت میں موجود ہو مگر اس میں جان نہ ہو۔ اس خوبصورت لاش کی ظاہری شان سے دھوکا کھا کر آپ اگر کچھ توقعات اس سے وابستہ کر لیں گے تو اتعات کی دنیا اپنے پہلے ہی امتحان میں اس کانا کارہ ہونا ثابت کر دے گی اور تجربے سے آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ ایک بد صورت مگر زندہ انسان ایک خوبصورت مغربے روح لاش سے بہر حال زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ ظاہر فریبوں سے آپ اپنے نفس کو تو ضرور دھوکا دے سکتے ہیں۔ لیکن عام واقع پر کچھ بھی اثر نہیں ڈال سکتے اور نہ خدا کی میزان ہی میں کوئی وزن حاصل کر سکتے ہیں۔ پس اگر آپ کو ظاہری نہیں بلکہ وہ حقیقی تقویٰ اور احسان مطلوب ہو جو دنیا میں دین کا بول بالا کرنے اور آخرت میں خیر کا پبلٹ اجھکانے کے لیے درکار ہے تو میری اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ اوپر کی یہ دونوں منزلیں کبھی نہیں اٹھ سکتیں جب تک ایمان کی بنیاد مضمون نہ ہو جائے اور اس کی مضبوطی کا ثبوت عملی اسلام یعنی بافعال اطاعت و فرمانبرداری سے نہ مل جائے۔

تقویٰ

تقویٰ کی بات کرنے سے پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ تقویٰ ہے کیا چیز۔ تقویٰ حقیقت میں کسی وضع و ہیئت اور کسی خاص طرز معاشرت کا نام نہیں ہے بلکہ دراصل وہ نفس کا یا اس کیفیت کا نام ہے جو خدا ترسی اور احساس ذمہ داری سے پیدا ہوتی ہے اور زندگی کے ہر پہلو

میں ظہور کرتی ہے۔ حقیقی تقویٰ یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کا خوف ہو۔ عبدیت کا شعور ہو۔ خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری و جواب دہی کا احساس ہو۔ اور اس بات کا زندہ ادراک موجود ہو کہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے جہاں خدا نے ایک مهلت عمر دے کر مجھے بھیجا ہے اور آخرت میں میرے مستقبل کا فیصلہ بالکل اس چیز پر منحصر ہے کہ اس دیے ہوئے وقت کے اندر اس امتحان گاہ میں اپنی قوتیں و قابلیتوں کو کس طرح استعمال کرتا ہوں، اس سروسامان میں کس طرح تصرف کرتا ہوں جو میثمت الہی کے تحت مجھے دیا گیا ہے، اور ان انسانوں کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہوں جن سے قضاۓ الہی نے مختلف حیثیتوں سے میری زندگی متعلق کر دی ہے۔ یہ احساس و شعور جس شخص کے اندر پیدا ہو جائے اس کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے۔ اس کی دینی حس نیز ہو جاتی ہے۔ اس کو وہ ہر چیز کھلنے لگتی ہے جو خدا کی رضا کے خلاف ہو۔ اس کے مذاق کو ہر وہ شے ناگوار ہونے لگتی ہے جو خدا کی پسند سے مختلف ہو۔ وہ اپنے نفس کا آپ جائزہ لینے لگتا ہے کہ میرے اندر کس قسم کے رحمانات و میلانات پر ورش پار ہے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کا خود محاسبہ کرنے لگتا ہے کہ میں کن کاموں میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں صرف کر رہا ہوں۔ وہ صریح ممنوعات تو درکنار مشتبہ امور میں بھی بتلا ہوتے ہوئے خود بخود چھکنے لگتا ہے۔ اس کا احساسِ فرض اسے مجبور کر دیتا ہے کہ تمام اور کوپوری فرمانبرداری کے ساتھ بجالائے۔ اس کی خدا ترسی ہر اس موقع پر اس کے قدم میں لرزش پیدا کر دیتی ہے جہاں حدود اللہ سے تجاوز کا اندریشہ ہو۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تغہداشت آپ سے آپ اس کا ویرہ بن جاتی ہے اور اس خیال سے بھی اس کا ضمیر کا نپ اٹھتا ہے کہ کہیں اس سے کوئی بات حق کے خلاف سرزد نہ ہو جائے۔ یہ کیفیت کسی ایک شکل یا کسی مخصوص دائرہ میں ہی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ آدمی کے پورے طرز فکر اور اس کے تمام کارنامہ زندگی میں اس کا ظہور ہوتا ہے، اور اس کے اثر سے ایک ایسی ہموار و یک رنگ سیرت پیدا ہوتی ہے جس میں آپ ہر پہلو سے ایک ہی طرز کی پاکیزگی و صفائی پائیں گے۔ بخلاف اس کے جہاں تقویٰ بس اس چیز کا نام رکھ لیا گیا ہے کہ آدمی چند مخصوص شکلؤں کی پابندی اور مخصوص طریقوں کی پیروی اختیار کر لے اور مصنوعی طور پر اپنے آپ کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال لے جس کی پیاس کی جا سکتی ہو، ہاں آپ دیکھیں

گے کہ وہ چند اشکال تقویٰ جو سکھادی گئی ہیں، ان کی پابندی تو انتہائی اہتمام کے ساتھ ہو رہی ہے، مگر اس کے ساتھ زندگی کے دوسرا ہے پہلوؤں میں وہ اخلاق، وہ طرز فکر اور وہ طرز عمل بھی ظاہر ہو رہے ہیں جو مقام تقویٰ تو درکنار، ایمان کے ابتدائی مقتضیات سے بھی مناسب نہیں رکھتے۔ یعنی حضرت مسیح کی تمثیلی زبان میں چھپر چھانے جا رہے ہیں اور اونٹ بے تکلفی کے ساتھ نگلے جا رہے ہیں۔

حقیقی تقویٰ اور مصنوعی تقویٰ کے اس فرق کو یوں سمجھتے کہ ایک شخص تو وہ ہے جس کے اندر طہارت و نظافت کی حس موجود ہے اور پا کیزگی کا ذوق پایا جاتا ہے۔ ایسا شخص گندگی سے فی نفس نفرت کرے گا خواہ وہ جس شکل میں بھی ہو اور طہارت کو بجائے خود اختیار کر لے گا خواہ اس کے مظاہر کا احاطہ نہ ہو سکتا ہو۔ بخلاف اس کے ایک دوسرا شخص ہے جس کے اندر طہارت کی حس موجود نہیں ہے مگر وہ گندگیوں اور طہارت کی ایک فہرست لیے پھرتا ہے جو کہیں سے اس نے نقل کر لی ہیں۔ یہ شخص ان گندگیوں سے تو سخت اجتناب کرے گا جو اس نے فہرست میں لکھی ہوئی پائی ہیں، مگر بے شمار ایسی گھناوی چیزوں میں آسودہ پایا جائے گا جو ان گندگیوں سے بدرجہا زیادہ ناپاک ہوں گی جن سے وہ نج رہا ہے، صرف اس وجہ سے کہ وہ اس فہرست میں درج ہونے سے رہ گئیں۔ یہ فرق جو میں آپ سے عرض کر رہا ہوں یہ محض ایک نظری فرق نہیں ہے بلکہ آپ اس کو اپنی انکھوں سے ان حضرات کی زندگیوں میں دیکھ سکتے ہیں جن کے تقویٰ کی دھوم پھی ہوئی ہے۔ ایک طرف ان کے ہاں جزئیات شرع کا یہ اہتمام ہے کہ داڑھی ایک خاص مقدار سے کچھ بھی کم ہو تو فشق کا فیصلہ نافذ کر دیا جاتا ہے۔ پانچ سو سے ذرا بیچھے ہو جائے تو جہنم کی وعید سنادی جاتی ہے۔ اپنے مسلک فقہی کے فروعی احکام سے ہٹنا ان کے نزد یک گویا دین سے نکل جانا ہے۔ لیکن دوسری طرف دین کے اصول و کلیات سے ان کی غفلت اس حد کو پہنچی ہوئی ہے کہ مسلمانوں کی پوری زندگی کا مدار انہوں نے رخصتوں اور سیاسی مصلحتوں پر رکھ دیا ہے۔ اقامت دین کی سعی سے گریز کی بے شمار را ہیں انہوں نے نکال رکھی ہیں۔ غلبہ کفر کے تحت ”اسلامی زندگی“ کے نقشے بنانے ہی میں ان کی ساری محنتیں اور کوششیں صرف ہو رہی ہیں۔ اور انہی کی غلط رہنمائی نے مسلمانوں کو اس چیز پر مطمئن کیا ہے کہ ایک غیر اسلامی نظام

کے اندر رہتے ہوئے، بلکہ اس کی خدمت کرتے ہوئے بھی ایک مدد و دار میں مذہبی زندگی بسر کر کے وہ دین کے سارے تقاضے پورے کر سکتے ہیں، اس سے آگے کچھ مطلوب نہیں ہے جس کے نئے وہ سعی کریں۔ پھر اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اگر کوئی ان کے سامنے دین کے اصلی مطالبے پیش کرے اور سعی اقامت دین کی طرف توجہ دلائے تو صرف یہی نہیں کہ وہ اس کی بات سنی ان سنی کر دیتے ہیں، بلکہ کوئی حیله، کوئی بہانہ اور کوئی چال ایسی نہیں چھوڑتے جو اس کام سے خود بچنے اور مسلمانوں کو بچانے کے لیے استعمال نہ کریں۔ اس پر بھی ان کے تقویٰ پر کوئی آنچ نہیں آتی اور نہ مذہبی ذہنیت رکھنے والوں میں سے کسی کو یہ شک ہوتا ہے کہ ان کے تقویٰ میں کوئی کسر ہے۔ اسی طرح حقیقی اور مصنوعی تقویٰ کا فرق بے شمار شکلوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ مگر آپ اسے تب ہی محسوس کر سکتے ہیں کہ تقویٰ کا اصل تصور آپ کے ذہن میں واضح طور پر موجود ہو۔

میری ان باتوں کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وضع قطعی، ایسا اور معاشرت کے ظاہری پہلوؤں کے متعلق جو آداب و احکام حدیث سے ثابت ہیں میں ان کا استخفاف کرنا چاہتا ہوں یا انہیں غیر ضروری قرار دیتا ہوں۔ خدا کی پناہ اس سے کہ میرے دل میں ایسا کوئی خیال ہو۔ دراصل جو کچھ میں آپ کے ذہن نہیں کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اصل شے حقوقی تقویٰ ہے نہ کہ یہ مظاہر۔ حقیقی تقویٰ جس کے اندر پیدا ہوگا۔ اس کی پوری زندگی ہمواری و یک رنگی کے ساتھ اسلامی زندگی بننے گی۔ اسلام اپنی پوری ہمہ گیری کے ساتھ اس کے خیالات میں، اس کے جذبات و روحانیات میں، اس کے مذاق طبیعت میں، اس کے اوقات کی تقسیم اور اس کی قوتیں کے مصارف میں، اس کی سعی کی راہوں میں، اس کے طرز زندگی اور معاشرت میں، اس کی کمائی اور خرچ میں، غرض اس کی حیات دینیوی کے سارے ہی پہلوؤں میں رفتہ رفتہ نمایاں ہوتا چلا جائے گا۔ بخلاف اس کے اگر مظاہر کو حقیقت پر مقدم رکھا جائے گا اور اس پر بیجا زور دیا جائے گا اور حقیقی تقویٰ کی قسم ریزی اور آبیاری کے بغیر مصنوعی طور پر چند ظاہری احکام کی تعمیل کرادی جائے گی، تو نتائج وہی کچھ ہوں گے جن کا میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا ہے۔ پہلی چیز دیر طلب اور صبر آزمائی ہے، بتدریج نشوونما پاتی اور ایک مدت کے بعد برگ وبارلاتی ہے، جس طرح

بیج سے درخت کے پیدا ہونے اور پھل پھول لانے میں کافی دیر لگاتی ہے۔ اسی لیے سطحی مزانج کے لوگ اس سے اپر آتے ہیں۔ بخلاف اس کے دوسری چیز جلدی اور آسانی سے پیدا کر لی جاتی ہے۔ جیسے ایک لکڑی میں پتے اور پھل اور پھول باندھ کر درخت کی سی شکل بنادی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تقویٰ کی پیداوار کا یہی ڈھنگ آج مقبول ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو توقعات ایک فطری درخت سے پوری ہوتی ہیں وہ اس قسم کے مصنوعی درختوں سے تو کبھی پوری نہیں ہو سکتیں۔

احسان

اب احسان کو لیجیے جو اسلام کی بلند ترین منزل ہے۔ احسان دراصل اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کے ساتھ اس قلبی لگاؤ، اس گہری محبت اس سچی وفاداری اور فدویت و جاں ثاری کا نام ہے جو مسلمان کو فنا فی الاسلام کر دے۔ تقویٰ کا انسانی تصور خدا کا خوف ہے جو انسان کو اس کی ناراضی سے بچنے پر آمادہ کرے اور احسان کا انسانی تصور خدا کی محبت ہے جو آدمی کو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ابھارے۔ ان دونوں چیزوں کے فرق کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ حکومت کے ملازموں میں سے ایک تو وہ لوگ ہیں جو نہایت فرض شناسی و تن دہی سے وہ تمام خدمات ٹھیک ٹھیک بجالاتے ہیں جو ان کے سپرد کی گئی ہوں۔ تمام ضالبوی اور قاعدوں کی پوری پابندی کرتے ہیں اور کوئی کام ایسا نہیں کرتے جو حکومت کے لیے قابل اعتراض ہو۔ دوسرا طبقہ ان مخصوص وفاداروں اور جاں ثاروں کا ہوتا ہے جو دل و جان سے حکومت کے ہوا خواہ ہوتے ہیں۔ صرف وہی خدمات انجام نہیں دیتے جو ان کے سپرد کی گئی ہوں، بلکہ ان کے دل کو ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی ہے کہ سلطنت کے مفاد کو زیادہ سے زیادہ کس طرح ترقی دی جائے اس دھن میں وہ فرض اور مطالبہ سے زائد کام کرتے ہیں۔ سلطنت پر کوئی آجخ آئے تو وہ جان و مال اور اولاد سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ قانون کی کہیں خلاف ورزی ہو تو ان کے دل کو چوٹ لگتی ہے کہیں بغاوت کے آثار پائے جائیں تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں اور اسے فرو کرنے میں جان لڑا دیتے ہیں۔ جان بوجھ کر خود سلطنت کو

نقسان پہنچانا تو درکنار اس کے مفاد کو کسی طرح نقسان پہنچتے دیکھنا بھی اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتا ہے اور اسی خرابی کے رفع کرنے میں وہ اپنی حد تک کوشش کا کوئی دفیقہ اٹھانہیں رکھتے۔ ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں بس ان کی سلطنت ہی کا بول بالا ہو اور زمین کا کوئی چپہ ایسا باقی نہ رہے جہاں اس کا پھر پرانا رہے۔ ان دونوں میں سے پہلی قسم کے لوگ اس حکومت کے مقین ہوتے ہیں اور دوسرا قسم کے لوگ اس کے محض۔ اگرچہ ترقیاں مقین کو بھی ملتی ہیں اور بہر حال ان کے نام اچھے ہی ملازموں کی فہرست میں لکھے جاتے ہیں۔ مگر جو سفر ازیاز محسین کے لیے ہیں ان میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں ہوتا۔ بس اسی مثال پر اسلام کے مقینوں اور محسنوں کو بھی قیاس کر لیجیے۔ اگرچہ مقین بھی قابل قدر اور قابل اعتماد لوگ ہیں، مگر اسلام کی اصل طاقت محسین کا گروہ ہے۔ اصلی کام جو اسلام چاہتا ہے کہ دنیا میں ہو وہ اسی گروہ سے بن آ سکتا ہے۔

احسان کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد آپ خود ہی اندازہ کر لیں کہ جو لوگ اپنی آنکھوں سے خدا کے دین کو فر سے مغلوب دیکھیں، جن کے سامنے حدود اللہ پامال ہی نہیں بلکہ کا عدم کردی جائیں، خدا کا قانون عملًا ہی نہیں بلکہ با ضابطہ منسون کر دیا جائے، خدا کی زمین پر خدا کا نہیں بلکہ اس کے باغیوں کا بول بالا ہو رہا ہو نظام کفر کے تسلط سے نہ صرف عام انسانی سوسائٹی میں اخلاقی و عملی گمراہیوں میں مبتلا ہو رہی ہو اور یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ان کے دلوں میں نہ کوئی بے چینی پیدا ہو نہ اس حالت کو بد لنے کے لیے کوئی جذبہ بھڑکے بلکہ اس کے برکس وہ اپنے نفس کو اور عام مسلمانوں کو غیر اسلامی نظام کے غلبے پر اصولاً و عملًا مطمئن کر دیں ان کا شمار آخر محسینین میں کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس جرم عظیم کے ساتھ مغض یہ بات انہیں احسان کے مقام عالی پر کیسے سرفراز کر سکتی ہے کہ وہ چاشت اور اشراق اور تہجد کے نوافل پڑھتے رہے، ذکر و شغل اور مرائبے کرتے رہے، حدیث و قرآن کے درس دیتے رہے، جزئیات فقہ کی پابندی اور چھوٹی چھوٹی سنتوں کے اتباع کا سخت اہتمام فرماتے رہے اور تزکیہ نفس کی خانقاہوں میں دینداری کا وہ فن سکھاتے رہے جس میں حدیث و فقہ اور تصوف کی باریکیاں تو ساری موجود تھیں مگر ایک نہ تھی تو وہ حقیقی دینداری جو "سردادندادوست در دوست"

یزید، کی کیفیت پیدا کرے اور ”بازی اگرچہ پانہ سکا سرتو کھوسکا“ کے مقام وفاداری پر پہنچا دے۔ آپ دینوی ریاستوں اور قوموں میں بھی وفادار اور غیر وفادار کی اتنی تمیز ضرور نمایاں پائیں گے کہ اگر ملک میں بغاوت ہو جائے یا ملک کے کسی حصے پر دشمن کا قبضہ ہو جائے تو باعیوں اور دشمنوں کے تسلط کو جلوگ جائز تسلیم کر لیں یا ان کے تسلط پر راضی ہو جائیں اور ان کے ساتھ مغلوبانہ مصالحت کر لیں، یا ان کی سرپرستی میں کوئی ایسا نظام بنائیں جس میں اصلی اقتدار کی بائیں انہیں کے ہاتھ رہیں اور کچھ صحنی حقوق اور اختیارات انہیں بھی مل جائیں، تو ایسے لوگوں کو کوئی ریاست اور کوئی قوم اپنا وفادار مانے کے لیے تیار نہیں ہوتی، خواہ وہ قومی فیشن کے کیسے ہی سخت پابند اور جزوی معاملات میں قومی قانون کے کتنے ہی شدید پیر و ہوں۔

آج آپ کے سامنے زندہ مثالیں موجود ہیں کہ جو ملک جرمنی کے تسلط سے نکلے ہیں وہاں ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے جنہوں نے جرمن قبضے کے زمانے میں تعاوون و مصالحت کی راہیں اختیار کی تھیں۔ ان سب ریاستوں اور قوموں کے پاس وفاداری کے جانچنے کا ایک ہی معیار ہے اور وہ یہ ہے کسی شخص نے دشمن کے تسلط کی مراجحت کس حد تک کی، اس کو منانے کے لیے کیا کام کیا اور اس اقتدار کو وہ اپس لانے کی کیا کوشش کی جس کی وفاداری کا وہ مدعا تھا۔ پھر کیا معاذ اللہ خدا کے متعلق آپ کا یہ گمان ہے کہ وہ اپنے وفاداروں کو پہچاننے کی اتنی تمیز بھی نہیں رکھتا جتنا دنیا کے ان کم عقل انسانوں میں پائی جاتی ہے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ بس داڑھی کا طول، ٹخنوں اور پاچھوں کا فاصلہ، تسبیحوں کی گردش اور درود و وظائف اور نوافل اور مراتبے کے مشاغل اور ایسی ہی چند اور چیزیں دیکھ کر ہی دھوکا کھا جائے گا کہ آپ اس کے سچے وفادار اور جانثار ہیں؟

غلط فہمیاں

حضرات! اب میں ایک آخری بات کہہ کر اپنی تقریر ختم کروں گا۔ عام مسلمانوں کے ذہن پر مدتلوں کے غلط تصورات کی وجہ سے جزئیات و نطاہر کی اہمیت کچھ اس طرح چھاگائی ہے کہ دین کے اصول و کلیات اور دینداری و اخلاقی اسلامی کے حقیقی جوہر کی طرف خواہ کتنی ہی

توجہ دلائی جائے، مگر لوگوں کے دماغ پر پھر کر انہی چھوٹے چھوٹے مسائل اور ذرا ذرا سی ظاہری چیزوں میں انک کر رہ جاتے ہیں جنہیں اصل دین بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس وباۓ عام کے اثرات خود ہمارے بہت سے رفقاء اور ہمدردوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ میں اپنا پورا ذریعہ سمجھانے میں صرف کرتا رہا ہوں کہ دین کی حقیقت کیا ہے، لیکن ان ساری کوششوں کے بعد جب دیکھتا ہوں یہی دیکھتا ہوں کہ وہی ظاہر پستی اور وہی اصول سے بڑھ کر فروع کی اہمیت دماغوں پر مسلط ہے۔ آج تین روز سے میرے پاس پر چوں کی بھرمار ہو رہی ہے جن میں سارے مطالیب اس کا ہے کہ جماعت کے لوگوں کی واڑھیاں بڑھوائی جائیں، پانچ ٹخنوں سے اوپنچے کرائے جائیں اور ایسے ہی دوسرے جزئیات کا اہتمام کرایا جائے۔ اس کے علاوہ بعض لوگوں کے اس خیال کا بھی مجھے علم ہوا کہ انہیں جماعت میں اس چیز کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے جس کو وہ ”روحانیت“ سے تغیر کرتے ہیں۔ مگر شاید وہ خونہیں بناسکتے کہ یہ روحانیت فی الواقع ہے کیا شے اسی بنابر ان کی رائے یہ ہے کہ نصب اعین اور طریق کا رتو اس جماعت کا اختیار کیا جائے اور ترکیم نفس اور تربیت روحانی کے لیے خانقاہوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ ساری باتیں صاف بتاتی ہیں کہ ابھی تک ہماری تمام کوششوں کے باوجود لوگوں میں دین کا فہم پیدا نہیں ہوا ہے۔ میں ابھی آپ کے سامنے ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کی جو تشریح کر چکا ہوں اس میں اگر کوئی چیز قرآن و حدیث کی تعلیم سے تجاوز کر کے میں نے خود وضع کر دی ہو تو آپ بے تکلف اس کی انشان دہی فرمادیں۔ لیکن اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی رو سے یہی ان چار چیزوں کی حقیقت ہے تو پھر خود ہی سوچنے کہ جہاں ایمان کے مقتضیات بھی پوری طرح تحقیق نہ ہوں، اور جہاں تقویٰ اور احسان کی جڑ ہی نہ پائی جاتی ہو وہاں آخر کوئی روحانیت پائی جاسکتی ہے جسے آپ تلاش کرنے جارہے ہیں۔ رہے وہ جزئیات شرع جن کو آپ نے دین کے اولین مطالبات میں شمار کر رکھا ہے تو ان کا حقیقی مقام میں آپ کے سامنے پھر ایک مرتبہ صاف صاف واضح کئے دیتا ہوں تاکہ میں اپنی ذمہ داری سے سکدوش ہو جاؤں۔

سب سے پہلے ٹھنڈے دل سے اس سوال پر غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول دنیا میں

کس غرض کے لیے بھیجے ہیں؟ دنیا میں آخر کس چیز کی کی تھی؟ کیا خرابی پائی جاتی تھی جسے رفع کرنے کے لیے انبیاء مبعوث کرنے کی ضرورت پیش آئی؟ کیا وہ یہ تھی کہ لوگ داڑھیاں نہ رکھتے تھے اور انہیں کے رکھوانے کے لیے رسول بھیجے گئے؟ یا یہ کہ لوگ تنخے ڈھانکے رہتے تھے اور انبیاء کے ذریعے سے انہیں کھلوانا مقصود تھا؟ یا وہ چند سنیتیں، جن کے اہتمام کا آپ لوگوں میں بہت چرچا ہے، دنیا میں جاری کرنے کے لیے انبیاء کی ضرورت تھی؟ ان سوالات پر آپ غور کریں گے تو خود ہی کہہ دیں گے کہ نہ اصل خرابیاں یہ تھیں اور نہ انبیاء کی بعثت کا اصل مقصود یہ تھا۔ پھر سوال یہ ہے کہ وہ اصل خرابیاں کیا تھیں جنہیں دور کرنا مطلوب تھا اور وہ حقیقی بھلاکیاں کیا تھیں جنہیں قائم کرنے کی ضرورت تھی؟ اس کا جواب آپ اس کے سوا اور کیا دے سکتے ہیں کہ خداۓ واحد کی اطاعت و بندگی سے انحراف، خود ساختہ اصول و قوانین کی پیروی، اور خدا کے سامنے ذمہ داری و جوابدہی کا عدم احساس، یہ تھیں وہ اصل خرابیاں جو دنیا میں رونما ہو گئی تھیں۔ انہیں کی بدولت اخلاقی فاسدہ پیدا ہوئے، غلط اصول زندگی راجح ہوئے اور زمین میں فساد برپا ہوا۔ پھر انبیاء علیہم السلام اس غرض کے لیے بھیجے گئے کہ انسانوں میں خدا کی بندگی و وفاداری اور اس کے سامنے اپنی جوابدہی کا احساس پیدا کیا جائے، اخلاقی فاضلہ کو نشوونما دیا جائے اور انسانی زندگی کا نظام ان اصولوں پر قائم کیا جائے جن سے خیر و صلاح ابھرے اور شر و فساد دبے۔ یہی ایک مقصد تمام انبیاء کی بعثت کا تھا اور آخر کار اسی مقصد کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔

اب دیکھئے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے محمد ﷺ نے کس ترتیب و تدریج کے ساتھ کام کیا۔ سب سے پہلے آپؐ نے ایمان کی دعوت دی اور اس کو وسیع ترین بنیادوں پر پختہ و مستحکم فرمایا۔ پھر اس ایمان کے مقتضیات کے مطابق بتدریج اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعے سے اہل ایمان میں عملی اطاعت و فرمانبرداری (یعنی اسلام)، اخلاقی طہارت (یعنی تقویٰ) اور خدا کی گھری محبت و وفاداری (یعنی احسان) کے اوصاف پیدا کئے۔ پھر ان مغلص موننوں کی منظم سی و جہد سے قدیم جاہلیت کے فاسد نظام کو مٹایا اور اس کی جگہ قانون خداوندی کے اخلاق و تمدنی اصولوں پر ایک نظام صالح قائم کر دیا۔ اس طرح جب یہ لوگ اپنے دل و دماغ، نفس و اخلاق،

افکار و اعمال غرض جملہ حیثیات سے واقعی مسلم، متقی اور محسن بن گئے، اور اس کام میں لگ گئے جو اللہ تعالیٰ کے وفاداروں کو کرنا چاہیے تھا، تب آپ نے ان کو بتانا شروع کیا کہ وضع قطع، لباس، کھانے پینے، رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے اور دوسرا طاہری برتاو میں وہ مہذب آداب و اطوار کو نے ہیں جو متقیوں کو زیب نہیں دیتے ہیں۔ گواپہلے مس خام کو کندن بنایا پھر اس پر اشرفتی کا ٹھپہ لگایا پہلے سپاہی تیار کئے پھر انہیں وردی پہنانی۔ یہی اس کام کی صحیح ترتیب ہے جو قرآن و حدیث کے غائر مطالعے سے صاف نظر آتی ہے۔ اگر اتباع سنت نام ہے اس طرز عمل کا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی مرضی پوری کرنے کے لیے ہدایت الہی کے تحت اختیار کیا تھا، تو یقیناً یہ سنت کی پیروی نہیں بلکہ اس کی خلاف ورزی ہے کہ حقیقی مومن، مسلم، متقی اور محسن بنائے بغیر لوگوں کو متقیوں کے طاہری سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے اور ان سے محسین کے چند مشہور و مقبول عام افعال کی نقل اتراؤ کی جائے۔ یہ سیئے اور تابنے کے بکڑوں پر اشرفتی کا ٹھپہ لگا کر بازار میں ان کو چلا دینا، اور سپاہیت، وفاداری اور جاں ثاری پیدا کئے بغیر نہے وردی پوش نمائشی سپاہیوں کو میدان میں لاکھڑا کرنا میرے نزدیک تو ایک کھلی ہوئی جعل سازی ہے۔ اور اسی جعل سازی کا نتیجہ ہے کہ نہ بازار میں آپ کی ان جعلی اشرفیوں کی کوئی قیمت اٹھتی ہے اور نہ میدان میں آپ کے ان نمائشی سپاہیوں کی بھیڑ سے کوئی معمر کہ سر ہوتا ہے۔

پھر آپ کیا سمجھتے ہیں کہ خدا کے ہاں اصلی قدر کس چیز کی ہے؟ فرض کیجیے کہ ایک شخص سچا ایمان رکھتا ہے، فرض شناس ہے، اخلاق صالح سے متصف ہے، حدود اللہ کا پابند ہے اور خدا کی وفاداری اور جاں ثاری کا حق ادا کر دیتا ہے، مگر طاہری فیشن کے اعتبار سے ناقص اور طاہری تہذیب کے معیار سے گرا ہوا ہے۔ اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ بس یہی تو ہو گی کہ ایک اچھا ملازم ہے مگر ذرا بد تمیز ہے۔ ممکن ہے کہ اس بد تمیزی کی وجہ سے اس کو مراد پ عالیہ نصیب نہ ہو سکیں، مگر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس قصور میں اس کی وفاداری کا اجر بھی مارا جائے گا اور اس کا مالک صرف اس لیے اسے جہنم میں جھونک دے گا کہ وہ خوش وضع اور خوش اطوار نہ تھا؟ فرض کیجیے کہ ایک دوسرا شخص ہے جو بہترین شرعی فیشن میں رہتا ہے اور آداب تہذیب کے الزام میں مکمال درجہ محتاط ہے۔ مگر اس کی وفاداری میں نقص ہے، اس کی فرض شناسی میں کمی ہے،

اس کی غیرت ایمانی میں خامی ہے۔ آپ کیا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس نقص کے ساتھ اس ظاہری کمال کی حد سے حد تک قدر خدا کے ہاں ہوگی؟ یہ مسئلہ تو کوئی گہر اور پیچیدہ قانونی مسئلہ نہیں ہے جسے سمجھنے کے لیے کتابیں کھنگا لئے کی ضرورت ہو۔ محض عقل عام ہی سے ہر آدمی جان سکتا ہے کہ ان دونوں چیزوں میں سے اصلی قدر کی مستحق کوئی چیز ہے۔ دنیا کے کم عقل لوگ بھی اتنی تمیز ضرور رکھتے ہیں کہ حقیقت میں جو چیز قابل قدر ہے اس میں اور خمنی خوبیوں میں فرق کر سکیں۔ یہ انگریزی حکومت آپ کے سامنے موجود ہے۔ یہ لوگ جیسے کچھ فیشن پرست ہیں اور ظاہری آداب و اطوار پر جس طرح جان دیتے ہیں اس کا حال آپ کو معلوم ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ان کے ہاں اصلی قدر کس چیز کی ہے؟ جو فوجی افسران کی سلطنت کا جھنڈا بلند کرنے میں اپنے دل و دماغ اور جسم و جان کی ساری قوتیں صرف کر دے اور فیصلے کے وقت پر کوئی قربانی دینے میں دریغ نہ کرنے وہ ان کے نقطہ نظر سے خواہ کتنا ہی اجڑا اور گناہ ہو، کئی کئی دن شیونہ کرتا ہو، بے ڈھنگا بابس پہنتا ہو، کھانے پینے کی ذرا تمیز نہ رکھتا ہو، رقص کے فن سے نا بد ہو، مگر ان سارے عیوب کے باوجود وہ اس کو سرا آنکھوں پر بٹھائیں گے اور اسے ترقی کے بلند ترین مرتبے دیں گے۔ بخلاف اس کے جو شخص فیشن، تہذیب، خوش تمیزی، اور سوسائٹی کے مقبول عام اطوار کا معیاری مجسمہ ہو، لیکن وفاداری و جا شار میں ناقص ہو اور کام کے وقت اپنے مصالح کا زیادہ لحاظ کر جائے اسے وہ کوئی عزت کا مقام دینا تو درکنار شاید اس کا کورٹ مارشل کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔ یہ جب دنیا کے کم عقل انسانوں کی معرفت کا حال ہے تو اپنے خدا کے متعلق آپ کا کیا گمان ہے؟ کیا وہ سونے اور تابنے میں تمیز کرنے کے بجائے محض سطح پر اشرفتی کا ٹھپپہ دیکھ کر اشرفتی کی قیمت اور پیسہ کا ٹھپپہ دیکھ کر پیسے کی قیمت لگادے گا؟

میری اس گزارش کو یہ معنی نہ پہنانا یئے کہ میں ظاہری محسن کی نفی کرنا چاہتا ہوں یا ان احکام کی تعییں کو غیر ضروری قرار دے رہا ہوں جو زندگی کے ظاہری پہلوؤں کی اصلاح و درستی کی متعلق دیے گئے ہیں۔ درحقیقت میں تو اس کا قائل ہوں کہ بندہ مومن کو ہر اس حکم کی تعییں کرنی چاہیے جو خدا اور رسول نے دیا ہوا اور یہ بھی مانتا ہوں کہ دین انسان کے باطن اور ظاہر دونوں کو درست

کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جو چیز میں آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مقدم چیز باطن ہے نہ کہ ظاہر۔ پہلے باطن میں حقیقت کا جو ہر پیدا کرنے کی فکر کیجئے، پھر ظاہر کو حقیقت کے مطابق ڈھالیے۔ آپ کو سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے ان اوصاف کی طرف توجہ کرنی چاہیے جو اللہ کے ہاں اصلیٰ قدر کے مستحق ہیں اور جنہیں نشوونما دینا نبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصلیٰ مقصد تھا۔ ظاہر کی آرائشی اول تو ان اوصاف کے نتیجے میں فطرۃ خود ہی ہوتی چلی جائے گی اور اگر اس میں کچھ کسر رہ جائے تو تمیلی مرحل میں اس کا اہتمام بھی کیا جاسکتا ہے۔

دوستو اور رفیقو! میں نے بیماری اور کمزوری کے باوجود آج یہ طویل تقریر آپ کے سامنے صرف اس لیے کی ہے کہ میں امرِ حق کو پوری وضاحت کے ساتھ آپ تک پہنچا کر خدا کے حضور بری الذمہ ہونا چاہتا ہوں۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کب اس کی مہلت عمر آن پوری ہو۔ اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ حق پہنچانے کی جو ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے اس سے سکدوش ہو جاؤں۔ اگر کوئی امر وضاحت طلب ہو تو پوچھ لیجیے۔ اگر میں نے کوئی بات خلافِ حق بیان کی ہو تو اس کی تردید کرو دیجیے۔ لیکن اگر میں نے ٹھیک ٹھیک حق آپ تک پہنچا دیا ہے تو اللہ آپ سب کو اپنے دین کا صحیح فہم بخشئے اور اس فہم کے مطابق دین کے سارے تقاضے اور مطالبے پورے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آ میں!

